میرا گاؤں

میرے گاؤں کا نام نانگل تھا اور اب بھی ہے۔نانگل اور کھیڑی دو جڑواں گاؤں تھے دونوں کے درمیان ایک بند یعنی پشتے تھا جو دونوں کو جدا کرتا تھا۔ نانگل کا پتے کچھ اس طرح کا تھا:" موضع نانگل ڈاکخانے کھیڑی تحصیل ناڑ ضلع روہتک اور ریاست دوجانہ" تقسیم ہند کے وقت یہ علاقے پنجاب تھا اور اب صوبے ہریانہ کا حصے ہے یہ گاؤں تحصیل ناڑ سے نومیل اور ضلع روہتک سے پچاس میل سے زیادے فاصلے پر واقع تھا اس کے اطراف میں مذکورے گاؤں اور قصبے تھے، " کھیڑی، گھڑی، پڑتل موڑی، کوسلی ریلوے اسٹیشن، بڑانگلے، چھوٹا نگلے اور جاٹوسانے، اس موضع میں اور اطراف میں قابل ذکر اقوام اور برادریاں رہتی تھیں مسلمان راجپوت، ہندو راجپوت، ہیر اور جاٹ وغیرے وغیرہ

اطراف کے دیہاتوں اور گاؤں آنے جانے کے لیے" پیدل، بیل گاڑی کی سواری، اونٹ کی سواری" اور اگر میسر آجائے تو" گھوڑا گاڑی" استعمال کرتے تھے کیونکے تحصیل اور ضلع تک کچے راستے تھے

گاؤں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن جو تقریبا چار یا پانچ میل کے فاصلے پر تھا گاؤں کی وجے تسمیے تو نہیں معلوم کیونکے تمام بزرگ اللے کو پیارے ہوگئے ہیں کس نے آباد کیا؟ اور کب کیا؟ بہرحال ریاست دوجانے کے نواب مسلمان تھے جبکے علاقے اور ریاست میں ہندوؤں کی اکثریت تھی گاؤں کے اطراف میں کئی قابل ذکر قلعے وسرائے تھے لیکن ان میں سے کچھ کا معلوم نہیں لہذا گاؤں کے بانی اجداد کے نام وغیرے میرے علم میں نہیں ان اجداد کا نام بھی نہیں معلوم، بس اتنا معلوم ہے کے' خواجے معین الدین چشتی 'کے دور میں لوگوں نے اسلام قبول کیا جنگ آزادی 1857 کے دوران گاؤں میں کوئی قابل ذکر مذہبی یا سیاسی شخصیت نہیں تھی بہرحال ریاست دوجانے کا قلعے دہلی سے تقریبا 20 سے 25 میل اور رواڑی شہر سے 9 تا 10 میل پر واقع تھا

گاؤں کے لوگ کسان تھے کھیتی باڑی کرتے تھے کچھ لوگ روزگار کے سلسلے میں ہندوستان کے بڑے شہروں میں جا کر ملازمتیں کرتے تھے اور اکثر لوگ فوج میں بھرتی ہو جایا کرتے تھے جیسا کے پاکستان میں چکوال اور جہلم کے لوگ زیادے تر فوج میں بھرتی ہوتے ہیں تعلیمی وسائل کی کمی کی وجے سے زیادے لوگ سپاہی بھرتی ہوتے تھے اکثر جو ترقی کرتے ہوئے اپنی اہلیت پر آگے بڑھتے وے گاؤں کو خیر باد کر دیتے تھے گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسیرا کرنے والوں نے تحریکوں میں حصے لیا ہجو ان کا انفرادی فعل تھا

گاؤں کی آبادی تقریبا ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی جس میں 99 فیصد راجپوت اور بقایا 1 فیصد نچلی ذات کے لوگ تھے گاؤں میں اکثریت ہندو راجپوتوں کی تھی مسلمان 25 سے 30 فیصد تھے گاؤں میں اسلام قبول کرنے سے پہلے رشتے داریاں تھیں، لہذا ہندو اور مسلمان اپنا تعلق بتاتے تھے اور گاؤں میں ہندو مسلمان ٹکراؤ نہیں ہوا گاؤں میں مختلف گوتھوں کے لوگ تھے جس میں چوہان، پوار اور جاٹو قابل ذکر تھے چوہان گوتھ کے لوگوں کی اکثریت تھی گاؤں چار محلوں میں تقسیم تھا جن کے نام کچھ یوں ہے

- محلہ بڑی کے
- محلہ گھڑی کے
- محلہ بابہ کے
- محلہ موڈہ کے

اور پانہ صرف دو تھے 1: بڑی گھڑی 2: بابہ

بابہ اور موڈہ راجپوت قوم پورہ برصغیر میں پھیلی ہوئی تھی لہذا خصوصی طور پر کرنال، روہتک، حصار ،ہانیسی یوپی اور صحرائہ راجپوتانہ جیسہ تقریبا تمام علاقوں میں رشتہ داریاں تھیں نچلی ذات کے علاوہ تمام گاؤں میں صرف راجپوت مسلمان یا ہندو بستہ تھے

گاؤں کے تمام باسی باہم مل جل کر رہتہ تھے گاؤں کا زرعی رقبہ بشمول جنگل پانچ ہزار (5000) ایکڑ تھا علاقہ بارانی ہونہ کی وجہ سہ کچھ بندوبست انحصار کنوؤں اور چرس پر تھا گاؤں کی پیداوار جو، چنا، جوار اور باجرہ تھی ہ اول الذکر پیداوار ہی خالص پیداوار تھی گاؤں کے چند افراد جو لوگوں میں مشہور یا متعارف تھے ان میں (1) جناب شفیع محمد خان ٹھیکیدار (2) پتی کبیر خان (3) ممتاز نمبر دار پتی خان (4) نمبردار عباس اور (5) ان کا بیٹا شیرو گاؤں کے جنگل میں ہیرن، نیل گائیں، ریچھ اور شیر کے علاوہ چھوٹہ بڑہ جانور پائہ جاتہ تھے گاؤں میں کوئی خاص دستکاری نہیں تھی خواتین صرف چرخہ استعمال کرتی تھیں اور اپنی گھریلو ضروریات کو پورا کرتی تھیں

گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا برابر والہ گاؤں کھیڑی میں پرائمری سکول اورد وسرہ گاؤں کے کنوالی میں مڈل اور ہائی سکول تھے دہلی سہ پہلہ کوئی کالج نہیں تھا، نزدیک ترین دہلی میں ہی تھا

عبدالغنی ولد حافظ شفیع محمد خان ٹھیکیدار کے چچا زاد بھائی اور اللہ بخش صاحب ٹھیکیدار کے بیٹہ محمد علی خان ایڈووکیٹ ،جنہوں نہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سہ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تھی اور حیدرآباد دکن میں اتحاد بین المسلمین کے لیڈروں میں سہ تھہ اور جناب رشید ترابی صاحب مشہور شیعہ عالم دین رشید ترابی کے ہم جماعت اور سید قاسم رضوی کے ہم عصر نواب بہادر جنگ کے ایک ادنیٰ سپاہی تھے جناب ممتاز خان ولد عمدہ خان پتی کبیر خان اور نمبردار عباس صاحب اور بابا امام الدین ہی سفید پوش اور معروف افراد تھے

1946-1947ء میں کوئی معروف سول یا آرمی آفیسر نہیں تھا گاؤں میں صرف ایک ہی مسجد تھی جو اس دور کے حساب سہ نہایت خوبصورت تھی گاؤں میں حافظ شفیع محمدمد خان ہی مشہور تھہ مگر ان کی وجہ شہرت ان کا پیشہ ٹھیکیداری ہی تھا گاؤں کے لوگ اہل سنت حنفی تھےسب سیدھہ سا دہلوگ کسی قسم کی فرقہ پرستی میں ملوث نہیں تھے گاؤں کے تمام لوگ ہر کلمہ گو کو اپنا بھائی سمجھتہ تھے پگڑی اور ٹوپی کے بغیر کوئی مسلمان شخص گاؤں میں نہیں گھومتا تھا اسی طرح گھوڑا اور اونٹ پر سوار شخص بھی نہیں گھومتا تھا گاؤں کی عورتیں پردہ کے لئہ چادر استعمال کرتی تھی یا دوپٹہ کا لمبا سا گھونگھٹہ شادی شدہ راجپوتی رسم و رواج خصوصا رنگڑی

رسم و رواج کے ہوتے تھے لوگ گاؤں میں یا اپنے رشتے داروں میں رشتے ناطے نہیں کرتے تھے بلکے اپنی گوتھ یا ذات برادری میں رشتے داری قابل ترجیح تھی

گاؤں کے بوڑھے افراد پچیسی کھیلتے تھے اور جوان لاٹھی چلانے گتکا،گھڑ سواری، نیزے بازی، گولے پھینکنا اور اونٹوں کی دوڑ کے شوقین تھے لوگ سوانگ (سٹیج ڈراموں) میں ہیر رانجھا کو پسند کرتے تھے اور قباچے کی سارنگی پسند کرتے تھے

گاؤں میں چند کنویں مشہور تھے جن میں باغ والا کنواں، جامن والا کنواں اور دھولیا درگو والا کنواں لوگ اپنے لئے پانی خود کنواں سے حاصل کرتے تھے یا پھرسقے (بہشتی) یہ کام کرتے تھے گاؤں میں ماجن والا جو بڑ مشہور تھا گاؤں میں پکے یعنی پختے مکانات اور کچے مکانات تھے گلیاں کچی تھیں دو منزلے مکانات عرف عام میں حویلی کہلاتی تھی

دوسرےگاؤں کے ہندو اور سکھوں نے حملے کیا جس میں ہیر اور جاٹ شامل تھے بلوائی گاؤں کو لوٹ نے سکے ہندو آرمی نے مسلمانوں سے گاؤں خالی کروا لیا زبردستی مسلمانوں کو در بدر کر دیا گیا گاؤں والے ناڑ کے کیمپ پہنچے اس کے بعد نگانے کے کیمپ میں چلے گئے وہاں سے بھوانی اسٹیشن ریل کے سفر کے لیے چلے گئے ہاس طرح اس" فاضل کا بنگلے" تک کا پیدل سفر کرکے پہلا پڑاؤ سایوال (میٹگمری) کیمپ میں آیا اس کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی اور سہولت اور ضرورت کے مطابق ملکے ہنس، پاکپتن، بورے والا، کبیر والا، ملتان، ضلع اوکاڑے اور چک A-4 میں رہائش اختیار کی یعنی خود کو آباد کیا اور آزاد وطن میں اپنی زندگی کا آغاز کیا

قیام پاکستان سے قبل محمد علی خان ایڈووکیٹ ولد اللہ بخش حیدرآباد دکن کی سولے رکنی شوری جس میں آٹھ عوامی منتخب نمائندے تھے جس میں ضلع نظام آباد کی نمائندگی کرتے تھے جنہیں ممبئی ایئرپورٹ پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قائد اعظم محمد علی جناح صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اپنے خاندان کا شجرے نسب بزرگوں کے تعاون سے بڑی کاوش کے بعد مرتب کیا اور اپنے عزیزوں کو مہیا کیا

رانا توفیق احمد خان ولد کنور ولی محمد خان مرحوم، پہلا طویل قیام لانڈھی D-4 کراچی، 1957ء تا 2002ء ،اسکے بعد چار سال ڈیفنس ویو 2002ء تا 2006ء، اس کے بعد المسلم سوسائٹی صفورا 2006ء تا 2016ء اور اب مکان نمبر C-159 بلاک 1 گلستان جوہر کراچی 2016 تا حال

فون نمبر:021-34166657

موبائل نمبر 0308-2406132

حالات و واقعات (قبل و بعد ہجرت)

کافی عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو ضبط تحریر کروں صرف ہمت کرنے کی بات تھی، دوسری یہ کہ کہاں سے ابتدا کی جائے مجھے میری امی جان نے بتایا تھا کہ میں 27 رمضان المبارک کی سحری کے وقت پیدا ہوا تھا ،عیسوی سال کا صحیح تعین نہ کر سکیں ،میرے حساب سے 1943,1942 یا 1944 کا ماہ رمضان شریف تھا ،بہرحال ریکارڈ میری تاریخ پیدائش 22 اگست 1944 ہیں

دادا حافظ شفیع محمد خان اور پر دادا عبدالغنی خان موضع نانگل تحصیل نا ڑ (ریاست دوجانہ ضلع روہتک)سابقہ مشرقی پنجاب اور موجودہ ہریانہ کے باسی تھے دادا مرحوم نے 14 سال کی عمر میں ریاست حیدرآباد دکن کا رخ کیا ہجاں دادا صاحب کے ماموں جناب حافظ اصغر علی خان صاحب قیام پذیر تھے اور ٹھیکیداری کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا شہر نظام آباد بعد جو کہ حیدر آباد دکن کا اوسط شہر تھا ہ ضلع کا درجہ رکھتا تھا ،اس کو اپنا مسکن بنا لیا تھا ہ

گاؤں میں اتنی زمین نہیں تھی کہ خوشحالی کی زندگی گزاری جا سکہ ہ ایک سال اپنے ماموں کے زیر تربیت رہنے کے بعد ماموں کے حکم کے مطابق ٹھیکیداری شروع کر دی ہاللہ تعالی کے فضل و کرم سے چند ہی سالوں میں کافی ترقی کرلی اور حافظ شفیع محمد خان کا بڑا ٹھیکہ داروں میں شمار ہونے لگا ہ ٹھیکدار بننے میں دادا صاحب نے بڑی محنت کی ہگھوڑے پر سوار ہو کر اور دریا گوداوری کو ٹوکروں پر بیٹھ کر پار کر کہ شب و روز محنت کر کہ مقام حاصل کی

دادا مرحوم اپنی آمدنی کا حصہ اپنے رشتہ داروں اور گاؤں والوں پر خرچ کرتے تھے انہوں نے کوئی لمبی چوڑی جائیدادیں نہیں بتائی ہندوپاک دستور یعنی کلچر کے مطابق خاندان یا گاؤں کی زمین گاؤں والوں کے پاس رہتو انہیں وقتن فوقتن گاؤں میں کچھ زمین خریدی

موضع نانگل بارانی علاقہ میں تھا پانی اور فصل کا دار و مدار باران رحمت یعنی بارش پر تھا ،جس کی وجہ سے باجرہ، جو، جواراور چنا یہاں کی فصل(پیداوار) تھی زیادہ تر لوگ ہندوستان کے بڑے شہروں میں محنت مزدوری کرتے تھے یا فوج میں سپاہی ہو جاتے تھے لوگ چھوٹی موٹی ملازمت ممبئی، دہلی اور اجمیر وغیرہ میں کرنا پسند کرتے تھے گاؤں میں صرف پرائمری تک کی تعلیم کا بندوبست تھا پرائمری سے آگے دوسرے گاؤں یا شہر جانا پڑتا تھا زیرزمین پانی دو سو فٹ یا اس سے زیادہ گہرائی والے کنوؤں سے حاصل کیا جاتا تھا ،جو کہ ربڑ کے بکو ں سے نکالا جاتا تھا بکوں یعنی ربڑ کی بڑی بڑی تھیلی یا ڈول ،بیلوں کی جوڑی یا گاؤں کے 4،6 جوان مل کر پانی کنوئیں سے کھینچ کر حاصل کرتے تھے

مختصرا یہ کہ مرحوم دادا حافظ شفیع محمد خان نے اپنی عملی زندگی کا آغاز 14 برس کی عمر سے کیا ۔تعلیم کی کمی کا احساس تھا ،جس کی وجہ سے اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں زیر تعلیم طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کو تعلیم مکمل کرنے میں مدد دیتے تھے ۔حیدرآباد دکن نظام آباد شہر سے تقریبا 40 میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا شہر" نرمل" جو اپنی ہنڈی کرافٹ کی وجہ سے مشہور تھا ایک بڑا قطعہ اراضی شہر سے منسلک لب سڑک جس کا رقبہ میری دانست میں 25 مربع ایکڑ سے کم نہیں تھا ،جس روڈ کی جانب کا حصہ جو آجکل فرنٹ کہلاتا ہے ،کالہ پتھر کی ایک منزلہ عمارت تعمیر کروائی ۔عمارت کی پلنتھ تقریبا 5 تا 4 فٹ تھی اور کمروں کی اونچائی 15تا 16 فٹ تھی۔ عمارت کے بائیں حصہ میں مین دروازہ سے قریب کنواں تھا (جسے حیدرآبادی باولی کہتے تھے) ۔

حیدرآباد دکن مسلمانوں کی آبادی کا 8%فیصد سے 12% فیصد تھا تا باقی ہندو آبادی تھی۔

1940 کے دور میں مزدور کی اجرت بہت کم تھی۔ عورت اور مرد دونوں مزدوری کرتے تھے۔ عورت کو 50 پیسے اور مرد کو ایک روپیہ مزدوری ملتی تھی۔ عام آدمی جوار کی روٹی کھاتا تھا ،دوسرے نمبر پر چاول کا استعمال ہوتا تھا، اچھے خاصے سفید پوش بھی گندم کی روٹی بہت کم کھاتے تھے۔ اللہ تعالی کا نظام تھا کہ دکن میں چار ماہ مسلسل بارش ہوتی تھی اور بارش کے پانی کو کچے پکے ڈیموں اورتالابوں میں جمع کرکے سالوں استعمال کیا جاتا تھا ،ساتھ ہی ساتھ زیر زمین بھی استعمال ہوتا تھا ۔

1953 ء میں پاکستان بننے سے 6 سال پہلے تک سعودی انڈیا اور خاص کر حیدرآباد دکن میں روزگار کے لئے آتے تھے۔ حیدرآباد دکن کے حکمران میر عثمان علی خان سعودیوں کی بڑی مدد کرتے تھے ۔حیدرآباد دکن میں سعودیوں کو چاوش کہتے تھے ۔میر عثمان علی زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ اور غیرہنرمند سعودیوں کو چوکیداری کی نوکری دیتے تھے اگر نوکری نہیں ملتی تو ان کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا، میری معلومات کے اس دور میں ماہانہ وظیفہ پینشن صرف 7 ہزار روپے ماہانہ تھی ۔بہرحال ریاست حیدرآباد دکن ایک خوشحال ریاست تھی ۔شمالی ہندوستان ،یوپی، پنجاب اور سی پی برادری کے لوگ جس میں موجود ہریانہ بھی شامل ہیں پڑھے لکھے لوگ ملازمت اور دیگر لوگ محنت مزدوری اور کاروبار کے لیے آتے تھے سرکاری ملازمتوں میں بھی شمالی ہندوستان کے لوگ کافی تعداد میں تھے۔

تقسیم ہند سے تقریبا چالیس سال پہلے دادا صاحب مشرقی پنجاب سے دکن آئے تھے اور تقسیم ہند سے قبل نا لمٹ ٹھیکیدار تھے۔ پاکستان کے قیام کے ایک سال بعد حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے روز یعنی 11 ستمبر 1948 کو بھارت نے حملہ کرکے حیدرآباد دکن پر قبضہ کرلیا جسے حیدرآباد لوگ پولیس ایکشن کہتے ہیں۔ زوال حیدرآباد کے بعد حیدرآباد دکن میں مسلمانوں کا زوال شروع ہوا کیونکہ مقامی آبادی میں 88 فیصد تعداد ہندوؤں کی تھی ۔ہندو آبادی نے ہر سطح اور ہر جگہ اپنا قبضہ اور تسلط قائم کر لیا ۔مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے بند ہوگئے۔ اور کاروبار پرشرنارتھیوں یعنی پاکستان سے باہر جانے والے ہندوؤں کا قبضہ اور تسلط ہوگیا۔

تقسیم ہند کے وقت دادا صاحب کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے سب شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے

بیٹی مریم کی پہلی شادی صدیق ولد اسحاق سے ہوئی تھی جلد ہی صدیق صاحب کا صاحب کا انتقال ہوگیا،اس کے بعد بڑی بیٹی صدیق کے بھائی غلام قادر کے نکاح میں چلی گئی

صدیق صاحب گھر داماد تھے لہذا غلام قادر صاحب بھی گھر داماد ہو گئے دوسری بیٹی نور جہاں کی شادی بھی اپنے محسن ماموں حافظ اصغر علی خان کے بیٹے حافظ نیاز محمد خان صاحب سے کردی حافظ نیاز محمد صاحب کی پہلی منکوحہ انتقال فرما چکی تھی بڑے داماد غلام قادر صاحب کی دس اولادیں تھیں چار بیٹے چھ بیٹیاں ،جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی فوت ہوگئے ہیں، صاحب اولاد تھے

دوسرے داماد حافظ نیاز محمد خان کی صرف تین بیٹیاں تھیں خورشید، طاہرہ اور قمر تینوں فوت ہو چکی ہیں اور ان کی اولاد کچھ پاکستان اور کچھ لندن میں، بڑی بیٹی کی کوئی اولاد نہیں تھی تیسری بیٹی انوری عرف (انی) حیات ہیں اور پھوپھامجید خان صاحب انتقال فرما چکے ہیں ہماری تیسری بڑی پھوپھی اپنے گھر کی تھیں، ان کی چھ اولادیں ہیں دو بیٹے اور چار بیٹیاں

دادا صاحب کی نرینہ اولاد میں دو بیٹے تھے کنور ولی محمد خان اور محمد بشیر تھے دادا صاحب کی دلی خواہش تھی کے ان کے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں ابتدائی تعلیم اپنے شہر نظام آباد میں دلوانے کی کوشش کی ،جب انہوں نے توجہ نہیں دی تومجبورہوکر ریاست کے صدر مقام کیپٹل حیدرآبادشہر میں بورڈنگ اسکول میں جو ریاست کے بہترین اسکولوں میں شامل ہوتے تھے داخل کروایا ،لیکن نتیجے صفر رہا بورڈنگ اسکول میں جاکر اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے جاگیرداروں اور نوابوں کی اولاد کے مشاغل اپنا لیے چاچا صاحب تو صاف انکار کر دیا کے میں نہیں پڑھونگا ،لیکن والد صاحب نے کچھ وقت گزارافائدے کے بجائے نقصان ہوا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اولاد دست بازو بننے کے بجائے بوجھ بن گئی والدے صاحبہ یعنی اماں جان کے والد صاحب بھی ٹھیکیدار تھے اور دادا صاحب کے چچا زاد بھائی تھے بو علی بخش ،اللہ بخش اور جان محمد پردادا عبدالغنی کے چچا زاد بھائی تھے والدے صاحبہ اللہ بخش صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اپنے سسر حافظ شفیع محمد خان صاحب بھائی مخاطب کرتی تھیں ہماری نانی "طوفن" ہماری دادی کی حقیقی بہن تھیں یعنی والدے صاحبہ کی خالہ ہندوستان پاکستان میں خالہ کو موسی کہتے ہیں اور خالہ زاد بھائی کو مشیر کہتے ہیں اسی طرح والد صاحب والدے صاحبہ کے مشیر بھائی تھے کیونکے ان کی نانی اور دادی صاحبہ دونوں کا تعلق بلیالی سے تھا موضع بلیالی تحصیل ریواڑی تھی اور ضلع گڑ گاؤں میں واقع تھا یہ تو تھی ابتدائی معلومات اپنے خاندان کے بارے میں

11ستمبر 1948 بروز وفات قائد اعظم محمد علی جناح (گورنر جنرل پاکستان اور بانی پاکستان)حیدرآباد دکن کا سقوط ہوگیا یعنی انڈیا نے حیدرآباد دکن پر غاصبانہ قبضہ کرلیا سقوط دکن کے بعد والدصاحب کا نظام آباد اور نرمل میں رہنا مشکل

ہو گیا کیونکہ والد صاحب کا اتحاد المسلمین سے تعلق تھا اور ٹھیکیداری میں لوگوں سے مارپیٹ اور ان بن کی وجہ سے ہندوؤں سے دشمنی ہوگی لہذا دادا صاحب نے والد صاحب کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا ۔ پندرہ ماہ تک والد صاحب گھر روپوش رہے اور بڑی تگ وود بعد دادا صاحب نے براستہ ممبئی بحری جہاز کے پرمٹ بنوا کر پاکستان روانہ کردیا۔ ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد 'میں 'توفیق احمد ، بھائی رفیق احمد،اور بہن ساجدہ عرف (پتلی) اور والد صاحب اوروالدہ صاحبہ بحری سفر کے بعد کراچی پہنچے۔ کراچی میں اس وقت ہمارا کوئی عزیز نہیں تھا ۔ والد صاحب نے ہوٹل میں قیام کیا ،ہوٹل کا نام کراچی ہوٹل تھا۔ یہ بولٹن مارکیٹ کی لب سڑک پر واقع تھا ۔والد صاحب کو کچھ کچی پکی معلومات تھی ۔ ہمارے ایک دور کے جاننے والے صدیق صاحب گاؤں کے نام کی مناسبت سے صدیق بھاٹلیا کہلاتے تھے۔ کراچی میں جوتوں کی دکان تھی۔ بولٹن اور برنس روڈ ہی کاروباری مرکزتھا،دو تین دن کی تگ و دو کے بعد تلاش کرلیااور صدیق بھاٹلیہ صاحب سے معلوم ہوا کہ والد ۔ صاحب کے حقیقی چچا زاد بھائی سلیمان خان صاحب بھی کراچی میں ہیں کیونکہ اس دوران لوگ خاموشی سے ہجرت کرتے تھے۔ ماموں سلیمان خان صاحب ہمیں ہوٹل سے اپنے گھر حیدرآباد کالونی لے گئے ۔ ہم سلیمان ماموں کے گھردو ہفتے مہمان رہے ۔اس کے بعد قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے لیا ،غالبا وہ مکان بھی ماموں صاحب کی ملکیت ہی تھا جو کہ موجودہ بہادر یار جنگ کے بالکل عقب میں تھا۔دادا صاحب کے حکم پر ہم نوابشاہ چلے گئے۔والد صاحب نے محکمہ سیٹلمنٹ سے سے ایک مکان مارکیٹ روڈ نوابشاہ پرالاٹ کروا لیا تھا۔مکان ڈبل سٹوری اور لب سڑک مارکیٹ کے درمیان تھا۔والد صاحب اور پھوپھا عبدالمجید خان صاحب کو بھی ایک مکان موچی گلی مونی بازار میں الاٹ کروا لیا اس مکان کا ایک دروازہ موچی گلی میں اور دوسرا دروازہ مونی بازار کی طرف نکلتا تھا۔جہاں نگلہ والے رہتے تھے اور زمانے سیکنڈ لیفٹیننٹ اور "1965 "کے "بریگیڈیئر بشیر صاحب "نگلہ والوں کا مکان تھا۔پھوپھا صاحب کا مکان بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔والد صاحب نواب شاہ شہرمیں مسلم لیگ کے نائب صدر تھے اور ایک مخلص کارکن بھی تھے،مہاجرین کی فلاح و بہبود اور آبادکاری کے لئے بہت کام کیااور کسی قسم کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔تھوڑے عرصہ بعد مسلم لیگ والوں کو دفتر کی ضرورت پڑی،والد صاحب نے مکان کے محل وقوع کی مناسبت سے اپنے مکان کو مسلم لیگ کے د فتر کے لیے دے دیا۔اس کے بدلے میں محلہ منو آباد جہاں مہاجرین کی اکثریت رہتی اور تمام لوگ اردو بولنے والے رہتے تھے۔ایک مکان لے لیا۔مکان کے اطراف تین طرف راجستانی (باگڑی) رہتے تھے اور ایک طرف اجمیر شریف کا شہری ماحول، پڑھی لکھی فیملیاں رہتی تھی۔ہمارے سامنے انعام اللہ صاحب رہتے تھے،ان کے ایک بھائی کسی سرکاری محکمہ میں کام کرتے تھے اور چھوٹے بھائی وکالت کر رہے تھے، ابھی ان کی وکالت کی ابتدا تھی۔انعام اللہ خان صاحب بھی ایک دیرینہ کارکن تھے۔والد صاحب اور انعام اللہ خان صاحب مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔اگر چاہتے تو بہت کچھ فائدہ حاصل کرسکتے تھے۔والد صاحب کو کمانے کھانے کی فکر تو تھی ہی نہیں کیونکہ حیدرآباد دکن سے دادا صاحب گزر بسر کے لیے ماہانہ بنیاد پر پیسے بھیجتے رہتے تھے۔

ہمارے والد صاحب نے میونسپلٹی میں ٹھیکیداری کی مگر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔گھریلو اخراجات کے لیے رقم دادا صاحب ہندوستان یعنی حیدرآباد دکن سے آنے

والوں کے ذریعے یا 'ہنڈی 'کے ذریعے پانچ سے دس ہزار بھیجتے تھے جو کے تین سے چار ماہ تک کے لیے کافی ہوتے تھے۔کچھ عرصے بعد لوگوں نے درمیان میں گڑبڑ شروع کردی جس کی وجے سے پریشانی لاحق ہونے لگی۔وقت کے ساتھ ساتھ دادا صاحب کے مالی حالات خراب ہونے لگے۔ حیدرآباد دکن آہستے آہستے ختم ہونے لگا،ایک وقت ایسا آیا کے بالکل ختم ہو گیا۔گھر کے حالات دگر گوں ہو گئے۔اس دوران والد صاحب کے سگے پھوپھا جن کا کوئی نہیں تھا وے ملکے ہنس نزد پاکپتن میں اپنے بھتیجے جس کا نام ارشاد تھا ان سے ناراض ہوکر نواب شاہ ہمارے پاس آگئے اور گھر کے فرد بن گئے۔ گھر کے حالات دیکھ کر والدے صاحبے کو مشورے دیا کے تم کسی طرح ہزار-پانچ سو بندوبست کرلو سرہاری میں میرے رشتے دار رہتے ہیں وہاں سے 2-3 بھینسیں خرید کر لے آؤں گا۔ والدے صاحبے نے کہا ہم نے کبھی بھینس نہیں پا لی،انڈیا میں تو یے سب کام نوکر چاکر (ملازم) کرتے تھے۔انہوں نے کہا مجھ سے جتنا کام ہوسکے گا کروں گا اور دودھ دوہنا میرا کام ہے تم اور بچے میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔

محترم پھوپھا صاحب کی کاوشوں سے گھریلو پریشانیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی، دادا صاحب کی مالی معاونت کا انحصار بالکل ختم نہیں ہوا۔ کبھی کبھی (ایڈ) امداد آجاتی تھی۔یے تھے <u>پاکستان آنے کے حالات و واقعات</u>

میرا اور میرے بڑے بھائی کا تعلیمی سلسلہ نظام آباد (دکن) کے پرائمری اسکول سے شروع ہوا۔ ایک سرکاری اسکول تھا۔بچے ٹاٹ پٹی پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔والدے صاحبے کے چچازاد بھائیوں کی اولادیں بھی سرکاری اسکول میں پڑھتی تھی۔نظام آباد میں انگلش میڈیم سکول جس میں کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے۔نظام آبادمیں ماموں محمد علی خان صاحب کے بچے ماڈل اسکول میں پڑھتے تھے تھے اور اماں جان کے چچازاد بھائیوں کے ساتھ ماڈل انگلش اسکول میں پڑھنے جانے لگے۔ماموں محمد علی خان نے دادا صاحب سے اصرار کرکے ماڈل انگلش اسکول میں داخل کروایا۔میں اور میری چھوٹی بہن ساجدہ(عرف پتلی) ماڈل انگلش پرائمری سکول کے طالب علم بن گئے۔

اس طرح زندگی کا پہلا اسکول جہاں باقاعدے یونیفارم تھی۔ لڑکے مہرون کلر کی شیروانی، سیاہ جوتے، سفید کرتا پاجامہ اور سر پر ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ لڑکیاں نیلے رنگ کی فراک (قمیض) اور سفید شلوار اور سیاہ جوتے بطور یونیفارم پہنتی تھیں۔ ہندو لڑکیاں نیلی فراک پہنتی تھیں۔یے 1948 کا ابتدائی دور تھا۔ یے میرے اور ساجدے کے تعلیمی کیرئیر کا آغاز تھا۔بڑے بھائی صاحب دادا کی محبت میں نرمل اور نظام آباد کے درمیان فٹبال بنے ہوئے تھے۔کبھی نرمل میں ہوتے اور کبھی نظام آباد،بہر حال ان کا بھی تیسری جماعت میں داخلہ ہوگیا۔ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کے سقوط حیدرآباد ہو گیا یعنی حیدرآباد دکن پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا۔جس روز بھارتی افواج ٹینکوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوئیں،ہم اسکول میں تھے۔ حیدرآباد دکن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ،لہذا ہندوؤں نے بھارتی فوج کو خوش آمدید کہا اور جلوس نکالے۔ 10 بجے دن کے قریب ایک جلوس نے ہمارے اسکول پر دھاوا بول دیا ۔اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بجادی اور' جیئے ہندـ' کے نعرے لگاتے ہوئے اسکول میں داخل ہوگئے ہیں۔ اسکول کے تمام طلباء تتر بتر ہو گئے اور اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی میں اور ساجدے

اسکول سے باہر نکل گئے ہماری کلاس کی ایک 'ہندو لڑکی 'تھی جو ہمیں اپنے گھر کی طرف لے گئی۔راستے میں ہندو بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا اور میرے سر پر ایک زوردار ہاتھ مارا اورمیرے سر سے ترکی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ بلوائی نعرے لگا رہے تھے- ترکی ٹوپی نہیں چلے گی- گاندھی ٹوپی چلے گی۔ بلوائی اس سے پہلے ہماری پٹائی کرتے، ہمارے ساتھ والی ہندو لڑکی کا والد آگیا اور بلوائیوں کے نرغے سے ہمیں نکال کر اپنے گھر کی طرف لے گیا اور ہم سے کہا کہ اس طرف سے نہیں جاؤ گے بلکہ سرکاری ہسپتال کے درمیان سے جاؤ گے،آگے مسلم اکثریتی محلے ہے تم خیریت سے گھر پہنچ جاؤ گے ہم بچتے بچاتے اپنے محلے لائن گلی پہنچ گئے ہم سے بڑی عمر والے بچے پہلے ہی گھر پہنچ چکے تھے اس طرح ہماری اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیاحالات نارمل ہونے کے بعد ہم اسکول گئے یا نہیں، یہ مجھے یاد نہیں ستمبر 1948 سے جولائی 1949 تک کا عرصہ نظام آباد میں رہے اور پھر پاکستان آگئے

پاکستان میں اسلامیہ ہائی اسکول اسٹیشن روڈ نوابشاہ میں پہلی جماعت میں داخلہ لیااسکول میں اول تا چہارم طلباءٹاٹ پٹری پر بیٹھ کر پڑھتے تھےمارکیٹ روڈ سے ہم منو آباد شفٹ ہو چکے تھےشہادت لیاقت علی خان کے ہونے تک ہم منو آباد ہی میں مقیم تھے میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا ہماری جماعت کے ٹیچر اردو کے پیریڈ میں اخبار پڑھوایا کرتے ہیں۔تعلیمی سال مارچ میں ختم ہوکر اپریل میں شروع ہوتا تھا مارچ 1953ء کو ہمارے ماموں کے گھر بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اشفاق احمد (عرف نواب) تھا-اس وقت پھوپھی صاحبہ پرانے نواب شاہ میں رہائش پذیر تھیں والدہ صاحبہ بلاناغہ پھوپھی صاحبہ کی مزاج پرسی کے لیے پرانے نوابشاہ روزانہ ایک چکر ضرور لگاتی تھی ۔ میں اور بہن جو کے والدہ صاحبہ کے ساتھ ہمراہ ہوتے تھے1951 سے 1956 تک کا عرصہ منوآباد میں گزارا ۔1951اسلامیہ سکول سے گورنمنٹ پرائمری اسکول غریب آباد میں داخلہ لے لیا اس کے بعد جماعت اسلامی والوں نے ایک مدرسہ (نیا مدرسہ کے نام سے) کھولا تھاجناب مصایب علی صاحب اور جناب طٰہٰ یاسین صاحب معروف استاد تھے جن کی زیر تربیت پانچویں جماعت پاس کی اور اس کے بعد مومنی بازار میں قائم اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب اللہ ڈنو صاحب تھےایک اور صاحب ہسٹری کے ٹیچر سر محمد قاسم صاحب ہمارے کلاس ٹیچر تھے،ان کی خوبی یہ تھی کے وہ تاریخ کے حافظ تھےاور ششم تا دہم انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے جناب مصایب علی صاحب جماعت اسلامی کے امیر بنے اور بیٹا مجاہد معائب علی سیاست میں آگیا۔بہرحال چوتھی اور پانچویں جماعت "نیا مدرسہ" سےجس کے بعد اسلامیہ ہائی سکول میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے مسلم ہائی سکول کچہری روڈ محلہ مومنی بازار میں داخلہ لے لیااس اسکول میں بہت سے راجپوت رانگڑ لڑکے پڑھتے تھے اور چوہدری عباس صاحب کا بڑا بیٹا حنیف راجپوت میرے بڑے بھائی صاحب کا ہم جماعت اور چھوٹا بیٹا شریف راجپوت میرا ہم جماعت تھاحنیف راجپوت نے ایک عرصہ لندن میں گزارا بھائی بھی1962 میں لندن چلے گئے تھے وہاں بھی ان کی دوستی قائم رہی۔چند مہینوں کے بعد موسم گرما کی چھٹیاں ہوگئی والدہ صاحبہ نے حیدرآباد دکن جانے کا پروگرام بنا لیا والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب 1955 کے شروع میں انڈیا کا دورہ کر چکے تھے لہٰذا 'میں' نے امــاں جــان اور پتلی نہ1955کی جــون جــولائی میں پروگــرام

بنایاجوکہ ستمبر 1955 میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور ہم 19 ستمبر 1955میں دکن پہنچے۔۔ہم پانی کے جہاز سے براستہ ممبئی سے نظام آباد حیدرآباد پہنچے۔1955 کے زمانے میں انڈیا پاکستان میں کرکٹ کے کھیل کا بڑا چرچا اور شوق تھا میں نے انڈیا جاتے وقت کٹ بیگ تیار کیا اور انڈیا لے گیا۔ممبئی میں کسٹم والے نے پریشان کیا مگر میری ضد کرنے پر کسٹم والوں نے اجازت دے دی ویسے ہمارے پاس کوئی خاص سامان تو تھا ہی نہیں۔ ممبئی سے براستہ شہر حیدرآباد دکن جاتے ہوئے ہم کو اپنے جہاز میں ایک حیدرآبادی انتہائی شریف فیملی مل گئی تھی ۔ انہوں نے بڑا تعاون کیا ہمیں وہ اپنے گھر میں لے گئےاور ہمیں لنچ کروایا اور خود جا کر شام 4بجے نظام آباد جانے والی گاڑی میں سوار کروایا اور ہمارے ساتھ محبت اور خلوص سے پیش آئے اور والدے صاحبہ کا بہت ادب احترام کیا ہمغرب سے پہلے نظام آباد پہنچ گئے ۔جانا پہچانا شہر تھا، ویسے بھی دادا مشہور شخصیت تھے۔گلی محلے گتے داروں کا کہلاتا تھا (یعنی ٹھیکیداروں کی گلی) بہرحال بڑے آرام سے گھر پہنچ گئے۔

دادا صاحب بہت خوش ہوئے ۔وہاں عزیزوں کی فیملی بھی تھیں۔سب سے ملاقات ہوئی ۔ بڑے ماموں محمد علی خان صاحب کا گھر خریدنے والے ہندو شرنارتھی تھے۔ جن کا نام تھا 'ایل داس متھراس'اور ان کے تین بیٹے تھے۔لالے بھائی،راجو اور شنکر،ان سے میری دوستی ہوگئی۔ ہر وقت کراچی کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ مسلمان رشتے داروں اور عزیزوں سے تو دوستی تھی ہی۔ ہمارے پھوپھی زاد بھائی جمیل بھائی اور ڈاکٹر اقبال صاحب سے لالے بھائی کی دوستی تھی ۔ہمارے گھر کے پیچھے ایک خالی پلاٹ تھا اس کے بعد روڈ ،روڈ کراس کرنے کے بعد کھیلوں کے لیے ایک بہت بڑا میدان تھا ۔ حیدرآباد میں فٹ بال والی بال اور بیڈمنٹن زیادے کھیلی جاتی تھی کرکٹ کا نیا نیا شوق تھا۔مسلم لڑکے کرکٹ کھیلتے گراؤنڈ کے سامنے ۔ کھلی جگہ تھی ۔قلعے کی طرف کچھ سکھ لڑکے مارکیٹ سے آتے جاتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر ہماری پچ کو کراس کرتے تھے، منع کرنے پردھونس دکھاتے تھے۔ ایک دن میں بیٹنگ کر رہا تھا کے ایک سکھ لڑکے نے'پچ' کر اس کرنے کی شرارت کی۔ میں نے منع کیا تو کہا کیا کر لوگے پاکستانی! میں نے کہا اگر تم نہیں مانو گے میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ دوسرے لمحے اس نے قدم بڑھایا اور میں نے بلا گھمایا جو اس کے سر پر لگا۔ سکھ لڑکے کے سر سے خون بہنے لگا ہم نے کھیل فوری ختم کر دیا۔ کھلاڑی میدان میں جمع ہو گئے اور پچ پر بیٹھ گئے۔سکھ لڑکا اپنے گھر چلا گیا۔راجو نے مجھے کہا کے تم یہاں سے چلے جاؤ گھر نہیں جانا، اپنے جاننے والوں کی طرف چلے جاؤ اور میں نے فورا سبزی منڈی کا رخ کیا اور ایک خالی سبزی کی دکان میں نیچے تہہ خانے جا کر چھپ گیا ۔روشن دان سے کھیل کا میدان اور گھر وغیرہ صاف نظر آ رہا تھا ۔ تھوڑی دیر میں زخمی سکھ لڑکا ایک جلوس کی شکل میں آگیا اور کہا کہاں ہے وہ 'پاکستانی'۔ لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اور اس کے ساتھی بضد تھے لڑکے کا گھر بتاؤ۔مجمعے میں سے کسی نے اشارے سے گھر کی نشاندہی کی اور وہ جلوس کی شکل میں گھر پہنچ گئے، اتنے میں راجو کے بڑے بھائی لالے بھائی گھر پہنچ گئے ۔انہوں نے جلوس کے شرکاء کو سمجھا کر منتشر کر دیا اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ گھر والے بہت پریشان تھے ۔ہندو مسلم فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن لالے بھائی'معاملے'کو رفع دفع کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہفتے دس دن تک کرکٹ کا شوق ختم کرناپڑا اور اسی دوران ہمارا ویزابھی ختم ہوگیا۔والدے صاحبہ نے کراچی پہنچ کر نوابشاے جانے کا ارادے ترک کر دیا ،کیونکے

بھینسوں نے دودھ دینا ختم کر دیا تھا ،اس لیے نئی بھینسیں خریدنا پڑتیں۔نواب شاہ میں وسائل صفر ہو گئے تھے ۔۔ہم لوگ فاطمہ جناح کالونی میں گرین روڈ اسکول کے سامنے سلمان ماموں کے ہاں مہمان ہو گئے اور کراچی میں مستقل قیام کی جدوجہد شروع کر دی۔(والدہ صاحبہ بہت باہمت خاتون تھیں)۔

حیدرآباد کالونی میں موجودہ کشمیر روڈپر موجود ' شاپنگ مال 'کے سامنے ایک کچی آبادی 'اسلام آباد' کے نام سے تھی۔ جو کے واٹر بورڈ کے پمپنگ اسٹیشن کی زمین پر بنی ہوئی تھی ۔وہاں پر" شبر" کے چچا شریف اور چچی چھوٹی خالہ جن کا نام محبوب بیگم تھا ۔ایک جھونپڑی میں رہتے تھےاور ساتھ ہی میں ان کا بھینسوں کا باڑا تھا ۔ جھونپڑی کے ایک کمرے چٹائیوں کا سامنے چھوٹا سا صحن وہ بھی چٹائیوں سے گھیر کر بنایا ہوا تھا۔صحن میں ایک چٹائیوں کا کمرے بنایا گیا۔ جس کی لمبائی 11 یا 12 فٹ تھی اور چوڑائی تقریبا ساڑھے سات یا آٹھ فٹ تھی یعنی اگر جھگی کی چوڑائی میں لیٹتے تو سر اور پیر دیواروں کو لگ جاتے تھے۔اس جھگی میں ایک چولھا تھوڑا بہت کھانے پینے کا یعنی کچن کا سامان رکھ لیا گیا تھا۔کھانا پکانے سے پہلے فرشی بستر کا سمیٹنا ضروری تھا۔ ایک کونے میں مٹکا رکھا رہتا تھا۔ باہر پانی کی ایک چھوٹی سی پانی کی ٹینکی رکھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں خواتین کے لیے واش روم تھا۔ مرد حضرات گورنمنٹ کے پبلک ٹوائلٹ جو روڈ کے کنارے لائن سے بنے ہوئے تھے ،جس کے ساتھ خواتین کے لئے بھی علیحدہ ٹوائلٹ بنے ہوئے تھے،جو تمام آبادی استعمال کرتی تھی ۔نماز کے لیے مکے مسجد حیدرآباد کالونی جاتے تھے۔ رہائش کا مسئلہ تو وقتی طور پر حل ہوگیا تھا۔مسئلہ روزگار اور گزر بسر کے لیے آمدنی کا تھا۔ رفیق بھائی صاحب بھی نوابشاہ سے کراچی آگئے تھے۔ رفیق بھائی صاحب کو ٹی ٹی سی ٹیکنیکل ٹریننگ سینٹر میں واقع "این ای ڈی" یونیورسٹی کمپلیکس میں مکینیسٹ ٹریڈ میں داخلہ مل گیا تھا۔ جہاں آٹھویں کلاس کے بعد داخلہ ملتا تھا۔

اب آگے معاشی مسائل تھے ۔میں نے ابھی داخلہ نہیں لیا تھا۔ کریما مامی نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا، اگر توفیق مل میں کام کر سکتا ہے تو میں گودرا کیمپ میں خاتون سپر وائزر جو میری جاننے والی ،ان سے کام کے لیے بات کرتی ہوں ۔ والدہ صاحبہ نے بادل نخواستہ حامی بھر لی اور خاتون سپروائزر نے، جہاں وہ کام کرتی تھی۔ لیبر میں بھرتی کروا دیا۔بو انی مل سائٹ ایریا میں مجھے بوم سیکشن میں مشین آپریٹر لگا دیا۔سیشن انچارج نے مشین آپریٹ کرنے کا کام سکھا دیااور مشین پر کھڑا کر دیا ۔مسلسل آٹھ گھنٹے کھڑے رہنے کا کام تھا ۔اس زمانے میں آنے جانے کے لیے بوانی مل کی بسیں تھی ۔آٹھ گھنٹے کی مزدوری' ڈھائی روپے' ملتے تھے اگر اور ٹائم کریں تو اس کی مزدوری الگ سے ملتی تھی اور پندرہ دن میں مزدوری ملتی تھی۔ ایک پندرہ دن کا عرصہ سکون سے گزرا ۔ دوسرےپندرہ دن بعد گودراوالے لڑکوں نے سازش شروع کر دی ۔ دوسرے 15دن کی مزدوری دیتے ہوئے ہوئے اکاؤنٹ نے کہا کے کل سے تمہاری چھٹی۔ کسی اور مل میں جگہ تلاش کرلو۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے والا حساب ہو گیا۔اس دوران میں دادا صاحب نے نے کچھ رقم بھیج دی اور تسلی دی کے زیادہ پریشان نہیں ہونا ۔دکنی ایڈ ملنے کے بعد والدہ صاحبہ نے مجھے چھٹی جماعت کے لیےپیر الہی بخش کالونی میں یعقوب بھائی کے اسکول میں داخلہ دلوا دیا ۔میں اور یعقوب بھائی ہم جماعت بن گئے ۔ہماری جھگی

یعنی ہمارے محل کے سامنے بہت بڑا میدان خالی تھا جس میں مرد حضرات گرمی کے دنوں میں رات کو پلنگ میدان میں بچھا لیتے تھے۔

میری ایک ماں کی باوانی مل کی نوکری اور چھٹی جماعت میں دوبارہ داخلہ کے دوران جب سے میں نے اسکول جانا شروع کیا بھائی صاحب کے "TTC"طلباء نے "DJ" اور "NED" یونیورسٹی کے ساتھیوں کے ساتھ "یوم شہداء" کے موقع پر جلوس نکالا بھائی صاحب بھی جلوس میں شامل تھے۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے بعد فائرنگ ہوئی، بھائی صاحب کو اسی دوران آنسو گیس کا شیل لگا وہ بیہوش ہو گئے۔ حیدرآباد کالونی کے طلباء جو"DJ" اور "NED" کے طالب علم تھے، پہلے ہسپتال لے گئے اور پھر گھر لے آئے۔ اس طرح ایک سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا میں نے ساتھویں"VII" جماعت پاس کرلی اور بھائی صاحب کا مکینسٹ " Mechanist"کا کورس مکمل ہو گیا میں آٹھویں "VIII"جماعت میں پہنچ گیا کچھ عرصے کے بعد ایک دوپہر جھگیوں میں آگ لگ گئی اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہماری جھگی تک آنے سے پہلے آگ بجھ گئی شریف بھائی مرحوم کے بھینسوں کے باڑے کو تھوڑا نقصان پہنچا رفیق بھائی اور اباجان نواب شاہ سے آگے تھے کیونکے ابا جان نے ایک ہفت روزہ اردو اخبار" برق" 16 اکتوبر کو "شہید ملت خان لیاقت علی" کی پہلی برسی کے موقع پر نکالا تھا جس کے' ایڈیٹر' رفیق بھائی مرحوم اور' اونر' ابا جان تھے۔ برق اخبار میں ضلعی انتظامیہ ،وڈیروں اور سیاستدانوں کے بارے میں خبریں چلنے لگیں تو وڈیرہ کمشنراور ڈپٹی کمشنر پریشان ہو گئے انہوں نے "ہفت روزہ برق "کی انتظامیہ کو پریشان کرنا شروع کردیا، لہذا والد صاحب کراچی آگئے۔ اب کراچی کی جھگی میں گزارا کرنا مشکل ہو گیا تھا، لہذا حیدرآباد کالونی میں کرائے کے مکان کی تلاش شروع کر دی اتفاق سے ایک حیدرآبادی وکیل چراغ علی صاحب :جن کی اباجان نے کلیم کی زمینوں کے حصول میں کافی مدد کی تھی اور وہ مجید پھوپھا اوروالد صاحب کے اچھے دوست تھے۔ ہمارے پھوپھا مجید سے کہا اسلام آباد کی کچی آبادی میں ان کا ایک نیم پختہ کچے صحن کے ساتھ ایک مکان ہے، وہ لے لیں کرایہ جو مناسب ہو اور جب ہو، دے دینا اس طرح ہم تین کمروں کے مکان :جس کی چھت سیمنٹ کی چادروں کی تھی شفٹ ہو گئے۔شریف بھائی کو بھی باڑے کی وجہ سے جھگی چھوڑنی پڑی وہ بھی ان تین کمروں کے مکان کے ایک کمرے میں پارٹیشن بنا کر شفٹ ہو گئے۔ اسی دوران ظفر بھائی شبر اور ان کی والدہ" فاطمہ" بھی سکندر آباد پنجاب سے کراچی منتقل ہوگئیں وکیل چراغ علی صاحب کے مکان کا چوتھا کمرہ بھی ان سے درخواست کر کے حاصل کر لیا گیا اس طرح چار کمروں میں تین خاندان رہائش پذیر ہوگئے۔ سب کے بیت الخلا اپنے اپنے حصوں میں بنا دیے گئے۔ اور تھوڑا تھوڑا صحن بھی چٹائیوں کی باڑ لگا کر بنا دیا گیا ہمیں ایک بڑا اور ایک چھوٹا کمرہ ملا ،جس کا صحن ذرا بڑا تھا اس دوران جناب عبداللطیف خان جو 'انجینئر' تھے پیر الٰہی بخش کالونی پلاٹ نمبر 14 لیاری ندی کے کنارے رہتے تھے وہاں ہماری پھوپھی صاحبہ جو اپنے دیور کے مکان میں رہتی تھیں ۔ ان کی ساس اور سسر سے نہیں بنتی تھی لیکن پھر بھی انی اور مجید خالو کی فیملی ہمارے کچے پکے مکان کے صحن میں جھگی بنا کر منتقل ہوگئے۔ جب عبداللطیف خان صاحب کا ٹرانسفر" گھارو" میں فلٹر پلانٹ پر ہو گیا اور وہ K1منصوبے کے ایکسن ہوگئے، تووہ اپنے والدین کے ساتھ فلٹر پلانٹ گھارو کی سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہوگئے۔

یہ سلسلہ چھ سے آٹھ ماہ تک چلتا رہا۔ ہماری کچھی آبادی جس کا نام اسلام آباد تھا۔ ہمارے آس پڑوس میں زیادہ تر حیدرآبادی فیملیز تھیں اور اس کے بعد سائیڈ والے آبادی میں بریلی والے تھے۔ حیدرآبادی تعلیم یافتہ اورنیم تعلیم یافتہ تھے اور بریلی والی آباد ی میں زیادہ تر مزدور اور دیگر ہنرمند افراد رہتے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے یعنی جھگیوں کے سامنے واٹر بورڈ کا پمپنگ اسٹیشن اور بڑا میدان تھا۔ وہاں میدان میں ہم لوگ کرکٹ کھیلتے تھے اور پتنگ اڑاتے تھے۔میں ،ظفر بھائی اور شبر پتنگ اڑا رہے تھے۔ ایک بریلی والے لڑکے نے ظفر بھائی کی پتنگ کاٹ دی، ظفر صاحب نے بریلی والے لڑکے کو برا بھلا کہا اور پٹائی کر دی۔ پھر کیا تھا۔ پندرہ بیس بریلی والے لڑکے جمع ہوگئے۔ ظفر بھائی صاحب رفو چکر ہو گئے' شبر' بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔میں اور چند حیدرآبادی لڑکے مقابلہ کرتے رہے ،اسی دوران ایک بریلی والے لڑکے نے میرے سر پر لاٹھی ماری، جس سے میرا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر بریلی والے لڑکے بھی بھاگ گئے۔ چند حیدرآبادی بزرگ جمع ہوگئے اور اصرار کیا کے پولیس میں رپورٹ کی جائے۔ نہیں تو آئندہ بریلی والے شیر ہو جائیں گے۔ مختصرا یہ کے بریلی والوں نے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ بہر حال ظفر بھائی صاحب فساد کروا کر بھاگ گئے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد حکومت نے مہاجرین کی آبادکاری کے پروگرام کے تحت اسلام آباد کی کچھ آبادی کو لانڈھی منتقل کرنے کا اعلان کردیا۔

))کہانی شفٹنگ کی))

ہر ایک فیملی جن کا راشن کارڈ بنا ہوا تھا۔ ایک 80 مربع گز کا مکان ؛جس میں ایک کمرہ معہ دروازہ اور کچن، ٹوائلٹ چھت دار اور دروازہ کے تھا اور 7 فٹ کی چار دیواری اور مین گیٹ پر کڑی دروازہ تھا، الاٹ کیا ہم انیس سو ستاون بتاریخ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لانڈھی شفٹ ہو گے۔ محکمہ آباد کاری کے ٹرکوں میں ہمارا سامان لوڈ کر دیا گیا اورہر گھر کا ایک فرد اپنے سامان کے ساتھ ٹرک پر سوار ہوگیا ہمجھے اور' شبر' کو سامان کے اوپر بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ ہم محلے والوں کے ساتھ لانڈھی پہنچ گئے۔ ہماراکانوائے پہلے لانڈھی کے علاقہ B-4 میں پہنچا ،جہاں پہنچ کر ڈاکٹر افتخار عالم خاں، خالو مجید ہمارے پڑوسی سلام بھائی اور چنوں بھائی نے کہا ؛ہم اس علاقہ میں نہیں رہیں گے، ہمیں کسی دوسرے علاقہ میں کوارٹر دیے جائیں۔اس افسر محکمہ آبادکاری نے کہا آپ جو دس بارہ گھرانے ہیں، یہیں رک جائیں اور ایک ٹرک پر ہم تین چار افراد چلے جائیں اور جگہ چن لیں۔ بھلے مانس کی بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ لانڈھی نمبر6 موجودہ گلشن مارکیٹ (جہاں پہلے ویران میدان تھا) کے سامنے کے علاقہ میں بلاک نمبر 110-111 ، بلاک نمبر 108 اوربلاک نمبر 109 خالی تھے۔مارے سامنے والے بلاک 109 میں سے دو خاندان سلطان پوری آباد تھے (جو پوربی) زبان بولتے تھے۔ تین بلاکوں میں ہم حیدرآبادی قیام پذیر ہو گئے۔ ہمارے لانڈی پہنچ جانے کے بعد دیگر محلے والے اور شریف بھائی بمعہ بھینسوں کے پہنچ گئے۔ بہرحال جھگی سے پکی چھت والے کوارٹر میں منتقل ہونا اچھا لگا۔ ہم تمام محلے والے ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ ضروریات زندگی کے لیے آپس میں ادھار لینا معمول تھا۔ اس میں کوئی عاراور شرمندگی محسوس نہیں کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے یا دیگر مسائل اور پریشانی کا پوچھتے تھے اور ضرورت پڑنے

پر مدد بھی کرتے تھے اور شیئر(share) بھی کرتے تھے۔ابھی والد صاحب لانڈھی تشریف نہیں لائیں تھیں۔ والد صاحب ماموں کے مکان جیل روڈ حیدرآباد کالونی سے لانڈھی پہنچ گئی۔ 1958ء سے1960ء تک ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر رہے تھے۔ یہ عرصہ سیٹلمنٹ اور کلیموں کا تھا۔ مجید خالو کلیموں کے چکر میں تھے انہیں کافی زمین اور مکان وغیرہ مل گئے۔ والد صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہرحال مجید پھوپھا صاحب کے پاس پیسے کی آوت جاوت تھی۔ ابتدائی دنوں میں حالات بڑے سخت تھے مالی وسائل بالکل نہیں تھے کچھ کرنے کی جستجو میں کچھ تجربات کیے۔ میں نے اور 'شبر 'نے صبح سویرے گلیوں میں آواز لگا کر ڈبل روٹی اور پاپے فروخت کیے، جس میں مزہ نہیں آیا تو گلی گلی آواز لگا کر دودھ فروخت کیا۔چند دن دودھ کی دکان لگا کر دودھ فروخت کیا۔ کوئی خاص خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد کاغذ کے لفافے اور ماچس کی پیکنگ کا کام بھی کیا ،جس میں خواتین نے بھی تعاون کیا لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ اس تگ ودو میں ڈیڑھ سال نکل گیا۔ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش شروع کی مگر کراچی شہر میں نوکری نہیں ملی۔ اس وقت عبداللطیف خان صاحب ایکسن اور گھارو میں تھے انہوں نے اپنے خالہ زاد بھائی عبدالباسط اور رفیق بھائی کو انکاس نامی اٹالین کمپنی جو "72 انچ کی پائپ لائن کے منصوبے پر کام کر رہی تھی، نوکری دلوادی۔ عبدالباسط بھائی میٹرک کر چکے تھے، لہذا انہیں اسٹور پر لگا دیا اور بھائی کو ورک شاپ میں فٹر لگوادیا کیوں کے کمپنی میں مشینسٹ کی جاب نہیں تھی۔ وہاں پر انہوں نے on job جمیل استاد جو کے آل راؤنڈ ہیوی موٹر مکینک تھے، بھائی صاحب کو کام سکھادیا۔ بھائی صاحب انکاس کمپنی کے ورکشاپ نے کام کرتے تھے اور عبدالباسط بھائی اسٹور میں کام کرتے تھے۔ اس دوران عبداللطیف خان صاحب نے والد صاحب کی دوستی اور رشتے داری کی وجے سے فلٹر پلانٹ کے قریب ایک افسر کا بنگلہ دلوادیا۔ جس میں ہم اور عبدالباسط بھائی آدھے آدھے حصے میں رہتے تھے۔ عبدالباسط بھائی کے بچے وغیرہ نہیں تھے، لہذا ان کو تو ایک کمرا چاہیے تھا، بقایا تمام گھر ہمارے استعمال میں تھا۔ اس دوران ہم لوگ مکمل لانڈھی شفٹ ہو گئے تھے۔

"انی" اور ہمارا راشن کارڈ بنا ہوا تھا،لہذا ہمیں ایک ایک کوارٹر الاٹ ہوگیا۔ شریف بھائی کو جھگی اور باڑے کی وجے سے دو کوارٹر الاٹ ہوئے۔ ایک ان کے نام اور ایک ان کے ملازم گوالے کے نام + شریف بھائی کے چھوٹے بھائی اقبال صاحب پولیس والے نے جو باڑے میں رہتے تھے اور انہوں نے راشن کارڈ بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اقبال بھائی نے اپنے دوست نذر محمد جو کے راجپوت تھے جن کی بیوی کا نام وسیلہ تھا ان کا بھی راشن کارڈ بنوا رکھا تھا، اب مسئلہ بنا کے نذر محمد صاحب کی جھگی کہاں ہے؟ لہذا انہوں نے کمال ہوشیاری سے انی کی جھگی (کمرے) کو شفٹنگ والے روز دو حصوں میں تقسیم کر کے نذر محمد کو کوارٹر الاٹ کروایا دیا۔ بشیر چاچا سے کہا کے راشن کارڈ بنوالو مگر انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ بہرحال محکمہ آبادکاری (Rehabilitation) والوں نے لانڈھی شفٹ کردیا۔

××شفٹنگ کا قصہ ختم ہوا××

شریف بھائی صاحب کا بھینسوں کا باڑہ تھا، لہذا انہوں نے ایک کونے کے کوارٹر پر قبضہ جمالیا ہمحکمہ والوں نے اپنی لسٹ کے حساب سے الائنمنٹ دیے تھے اور

کوارٹر الاٹ کیے تھے مسئلہ پیدا ہوگیا بہرحال باہمی افہام و تفہیم سے ایک کواٹر پسند کرکے شفٹ ہوگئے کوارٹروں کے نمبر کی درستگی تقریبا پندرہ سال کے بعد ہوئی شفٹنگ کے دوسرے روز "انی" ااور مجید خالو(پھوپھا) لانڈھی آگئے چھوٹی خالہ، تائی(شبر کی والدہ) ظفر بھائی بھی لانڈھی شفٹ ہوگئے 20 کوارٹروں کی گلی میں 10-12 گھر آباد ہوئے باقی لوگ جیل روڈ حیدرآباد کالونی اور شہر میں رہ رہے تھے کوارٹروں کے فرش اور کمروں کے فرش کچے تھے اور صحن بھی کچا تھا' انی' کے بچے سلطانہ- نواب- اقبال لانڈھی سے جیل روڈ بہادر یارجنگ اسکول میں پڑھنے آتے تھے گلی میں صرف شبیر، توفیق اور سلیم بھائی کی فیملی گزارا کر رہے تھیں شبیر ماموں کی فیملی حیدر آباد کالونی میں مکان نمبر 129 میں کرائے پر رہتی تھی اسلام آباد کی سے قریب تھا صرف روڈ کراس کرنا پڑتا تھا اسلام آباد کے ساتھ حیدرآباد کالونی سے بھی رابطہ جڑا رہا انی کے بچے بہادر یارجنگ اسکول میں پڑھنے لانڈھی سے حیدرآباد کالونی آتے تھے عبداللہ کے والد صالح میاں کی حیدرآباد کالونی میں کریانہ(karyana) کی دکان تھی بشیر چاچا صاحب اس وقت KDA کے واٹر بورڈ میں ڈرائیور کم ورک مستری کام کر رہے تھے ان کی ڈیوٹی منو بھائی (عبد اللطیف خان صاحب) کے پاس تھی ،لہذا وہ بھی انی کے بچوں کے ساتھ جیل روڈ آتے تھے بچوں کو اسکول چھوڑ کر نیشنل اسٹیڈیم پہاڑی پر عبداللطیف خان کے گھر ڈیوٹی پر چلے جاتے تھے جب دل چاہا ڈیوٹی پر جاتے تھے اور جب موڈ ہواچھٹی کر لیتے تھے، کیونکہ محکمہ کے سربراہ عبداللطیف خاں تھے والد صاحب بھی ڈیوٹی کے بعد شبیر چاچا کی طرح خان صاحب کے گھر پہنچ جاتے تھے کبھی کبھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ بھی پکڑ لیتے تھے ٹھیکیداری کا خاندانی تجربہ تو تھا ہی، نئے ٹھیکیداروں کے ساتھ مل کر کام بھی کر لیتے تھے ۔ جس سے وقت پاس ہو جاتا تھا والد صاحب کی ٹھیکیداری سے گھر والوں کو کوئی سپورٹ نہیں ملی

گزرتے وقت کے ساتھ انڈیا میں حالات خراب ہونے لگے دادا صاحب کا کاروبار بالکل ختم ہوگیا ابراہیم ماموں نے بھی ٹھیکیداری پر انحصار کم کر دیا ٹرک چلوانے لگے ، کرش کا پلانٹ لگا لیا اور ریڈیو کی ایجنسی کا کاروبار شروع کر دیا ہ"مرفی" ریڈیو کی اور دیگر ایٹم کی ایجنسی لے لی

باواجی (دادا صاحب) چار خاندانوں کی کفالت کر رہے تھے دو گھر دماد، ایک سالے صاحب اور دو برخوردارن کاروبار سے ہٹ کر اہم مسئلہ نواسیوں کی شادی کا تھا انڈیا میں رشتے مل نہیں رہے تھے، حیدرآبادیوں میں کرنا نہیں چاہتے تھے صرف سالے صاحب ماما حنیف کی دوسری شادی حیدرآبادیوں میں کر دی تھی بہرحال کاروبار کی بندش اور نواسیوں کی شادی اور رشتوں کے چکر میں پاکستان آنا پڑا مختصرا جائیداد فروخت کرکے گزارے کر رہے تھے سونے پر سہاگا دونوں دماد جو کثیرالعیال جن کے افراد خانہ اورسالے صاحب اور ان کی اولاد جملہ 22 افراد پر مشتمل تھی بشمول دادا دادی (غلام قادر خان) 11افراد نیاز محمد خان چار افراد اور حنیف خان کے 6 افراد ہمارے پھوپھا صاحبان کی دانست میں والد صاحب اور چچا صاحب سے مشورے گنے کبیرے تھا بہرحال حافظ شفیع احمد خان صاحب کی کشتی بیچ سمندر میں پھنس گئی 1960ء کے ابتدائی ایام میں دادا صاحب و دادی صاحبہ، دامادوں، سالے کی فیملی اور نواسوں نواسیوں کے پاکستان تشریف لے آئے میں اس وقت نویں 9th جماعت کا طالب علم تھا دادا صاحب کے کنبے میں

کوئی بچہ میٹرک پاس نہیں تھا ۔ صرف نواسی طاہرہ نے حیدرآباد دکن سے میٹرک پاس کیا تھا ،وہ بھی بہ کار ہو گیا ۔اسے پاکستان میں دوبارہ میٹرک کا امتحان دینا پڑا ،اس وقت' میں' لانڈھی بالی اسکول کا طالب علم تھا۔ میٹرک والی بچیاں لانڈھی گرلز ہائی سکول میں اور دیگر لڑکیاں کورنگی نمبر 6 کا اسکول میں پڑھتی تھی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب سرکاری اسکولوں میں 9th اور میٹرک کی فیس تین روپے ماہانہ تھی، جو چھ چھ ماہ ادا نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ سے ہمارا نام خارج ہو جاتا تھا۔ ہماری دادی صاحبہ کو ہماری تعلیم سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ تو صرف اپنی نواسیوں اور نواسوں کی فیس وقت پر ادا کرتی تھی۔ ایک دفعہ دادی صاحبہ نے میری فیس لے کر نواسی کی فیس ادا کردی اور میرا نام کٹ گیا۔ میں سالانہ امتحان میں 9th میں انگلش کے مضمون میں فیل ہو گیا۔ دوبارہ میٹرک کے لیے 9th میں داخلہ لیا۔ مگر مالی حالات کی وجہ سے مجھے (توفیق) نذیراور جلیل کو بڑی تگ وود کرکے ڈاکیارڈ کی اپرنٹس شام میں داخلہ دلوایا گیا۔ نذیر نے تو میڈیکل میں گڑبڑ کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ میں اور جلیل پھنس گئے۔ ڈاکیارڈ کی اپرینٹس شپ انجینئرنگ اپرینٹس شپ تھی۔ یہ واقعہ 1960ء کا ہے۔ چار سال تک ہفتے میں دو روز اپرینٹس شپ اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ اور باقی چار دن پی این ڈاکیارڈ ر کی ورکشاپوں میں جانا پڑتا تھا۔ شروع میں ہم 60 اپرینٹس سلیکٹ ہوئے تھے۔ جس میں سے چار لڑکے انٹر پاس تھے، دس یا بارہ لڑکے میٹرک پاس، بقایا لڑکے بھی اپرینٹس نان میٹرک تھے۔ 1960ء سے 1965ء کا دور بڑا سخت تھا ۔ڈاکیارڈ میں دل نہیں لگتا تھا۔ صبح صبح 6 بجے گھر سے نکلنا پڑتا تھا ،تاخیر کی وجہ سے ہفتے میں دو تین چھٹی ہوجاتی تھی۔ ڈاکیارڈ کے بجائے کارساز میں اسکول برابر پابندی سے جاتا تھا۔ اسکول کا نام P.N.S Dockyard School تھا، کیونکہ اسکول میں باوردی افسران ،لیفٹیننٹ اور لیفٹیننٹ کمانڈر لیول کے افسران پڑھاتے تھے ۔صاف ستھرا ماحول اعلی بلڈنگ اعلی فرنیچر ہوتا تھا۔ ڈاکیارڈ میں ورکشاپ کا ماحول تھا یعنی چھوٹے اور استاد کا ماحول تھا، جو میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ دادا صاحب اور پھوپھا صاحب کی فیملی کی وجہ سے کوارٹر چھوٹے پڑ رہے تھے ۔اس دوران ماموں حنیف کی فیملی پنجاب قصبہ گرو چک 23/sp چلی گئی۔ وہاں گاؤں والوں نے ان کی آبائی زمین کا حصہ جو ان کا بنتا تھا، چچازاد بھائیوں سے دلوا دیا۔ بہرحال ایک فیملی پنجاب چلی گئی۔ دادا صاحب کا انڈیا چھوڑنے کا اصل مقصد نواسیوں کے رشتوں کا تھا۔ 1960ء کا دور دادا صاحب کے ابتدائی زوال کا دور تھا۔ بچی کچی جائیداد فروخت کر کے پاکستان میں مستقل قیام کرلیا لانڈھی کے کوارٹر تھے۔ بڑی فیملی اور آمدنی "صفر" صرف رفیق بھائی موٹر مکینک کی جاب کرتے تھے۔ جس سے 25 افراد کے کنبے کا خرچہ چلنا مشکل تھا رفیق بھائی صاحب بھی کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی وجہ سے پریشان ہوگئے۔ انہوں نے باہر جانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ اور انگلینڈ کا ورک پرمٹ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردی۔ رشتے نہ ملنے پر دادا صاحب خصوصی طور پر اور تمام گھر والے عمومی طور پر پریشان تھے۔ اور روز روز نئی منطق شروع ہو جاتی تھی۔ والدہ صاحبہ، دادا صاحب کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھیں۔ لوگوں نے مشورہ دیا ، خورشید آپا اور جعفری آپا کا رشتہ ولی ماموں کے بیٹوں سے کر دیا جائے۔ عمروں کا بڑا فرق تھا۔ لہذا ہم لوگوں کی جان چھوٹ گئی۔ 'شبر' کی والدہ اور والدہ صاحبہ نے رشتے تلاش کرنے میں بڑی محنت کی۔ نیاز محمد پھوپھا اپنی

بیٹیوں کی شادی اپنے چچا زاد بھائی' ادریس' کے بیٹوں سے کرنا چاہتے تھے اور وہ رشتے و تجویز کو Reject کر دیتے تھے اور ہماری دادی نیاز محمد کے مشوروں کو Reject کر دیتی تھی دادی صاحبہ اپنی نواسیوں کی شادی کراچی میں اور زیادہ سے زیادہ سندھ میں کرنے کی خواہشمند تھیں اور باپ نیاز محمد پنجاب میں نیاز محمد کی تقریبا 60 ایکڑ خاندانی زمین جس کے وہ اکلوتے مالک تھے کہروڑپکا میں شہر کے قریب تھی، مگر وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے چاہے ان کے سسر فاقے کریں 1960ء سے 1962ء تک بہت سخت حالات تھے 1963ء میں طاہرہ نے پرائمری سکول کی ٹریننگ کر کے نوکری 'پرائمری اسکول 'میں شروع کر دی خورشید آپا اور جعفری آپا کے رشتے مل گئے اور ان کی شادیاں ہوگئیں جمیل بھائی نے KRTC میں کنڈکٹری شروع کردی ہمارے وزیر نے میٹرک کے بعد کلرک کم ٹائپسٹ کی ADAمیں نوکری کر لی 1960ء سے1964ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا

اس کے بعد ایک اور گروپ کی لڑکیوں کی دادا صاحب کی ذمے داری تھی افسری - طاہرہ- قمر کی شادی تک دادا صاحب کی پریشانی اپنی جگہ پر تھی ،جو کے کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی ان حالات میں عبداللطیف خان نے بہت اخلاقی مدد کی اور والد صاحب کو ایک بڑا ٹھیکا برساتی نالوں کورنگی K ایریا سے کرنگی نمبر 5 تک دلوا دیا اب والد صاحب کے دل میں بھانجوں کی محبت جاگ گئی والد صاحب نے ٹینڈر' جمیل' کے نام پر داخل کرکے ٹھیکے لے لیا یہ ٹینڈر آگے جاکر پندرہ سے بیس لاکھ کا ہوگیا والد صاحب چاہتے تو اپنے نام کا ٹینڈر بھر کے لے لیتے والد صاحب کو اپنے بہنوئی صاحب کی مدد کرنی تھی، اس ٹھیکے میں چار حصے دار یعنی 4 پارٹنر تھے ابا جان، مجید خالو (پھوپھا) عبداللطیف خان صاحب اور غلام قادر خان صاحب بہرحال 1963ء کے آخر میں نالوں کا کام شروع ہو گیا اس زمانے میں' گورنمنٹ' سریا(لوہا) اور سیمنٹ خود دیتی تھی' گورنمنٹ' نے سریا اور سیمنٹ دینا شروع کیا جمیل بھائی کی لاٹری نکل گئی اور جمیل بھائی کا کاروبار شروع ہوگیا سیمنٹ اور سریا پر ہاتھ صاف کرنے لگے جس پر والد صاحب نے منع کیا تو جمیل بھائی اور پھوپھاغلام قادر شیر ہو گئے اور کہا" ٹھیکے ہمارا ہے "ہم جیسے چاہیں کریں باقی تینوں پارٹنرز کو ہری جھنڈی دکھادی دی باقی تینوں پارٹنرز پنچایت بازی کر کے اور گالیاں دے کر خاموش ہوگئے اس طرح 1964 سال گزر گیا نالے کا کام بھی' گورنمنٹ' کے پاس فنڈ نہ ہونے کی وجے سے بند ہوگیا جمیل بھائی پھر KPTC لوٹ گئے اس دوران نواب شاہ میں محمد علی ماموں کے انتقال کے بعد ان کی دو بیٹیوں زلیخا اور زبیدہ کے رشتوں کا معاملہ آگیا والدے صاحبہ کا پھر امتحان شروع ہوگیا ،انہوں نے پھر قربانی دینے کی ٹھانی عزیزوں کے کہنے پر اپنے بیٹوں کے رشتے کرنے کی پلاننگ شروع کر لی، ممانی صاحبہ "آمنہ" عرف (منے) نے رضامندی ظاہر کر دی یہ ایک نیا 'باب 'شروع ہوگیا رفیق بھائی صاحب 1962ء میں لندن چلے گئے تھے وہاں انھوں نے اپنی شادی کا چکر شروع کر دیا، والدے صاحبہ کو بڑی خفت اٹھانی پڑی والدے صاحبہ نے بھائی صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لہذا والدے صاحبہ کو معذرت کرنی پڑی ۔ بفضل اللہ تعالی یہ' چیپٹر 'بھی ختم ہوگیا1963ء سے1965ء کے عرصے میں بھائی صاحب وقتا فوقتا کچھ مالی معاونت کرتے رہتے تھے جس سے مالی مشکلات میں تھوڑی بہت کمی ہوئی 1964 میں ڈاکیارڈ ٹیکنیکل اسکول کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا ابھی ایک سال

ورکشاپ کا کام باقی تھا۔ ڈاکیارڈ اسکول کا سرٹیفکیٹ میٹرک کے مساوی تھا۔ انٹر سائنس میں داخلے مل سکتا تھا، اس سرٹیفکیٹ سے پورے انڈیا پاکستان میں انٹر سائنس میں میں داخلے مل سکتا تھا۔ لیکن کراچی اور سندھ میں نہیں۔ میں نے ایک نائٹ کالج میں جو لاہور یونیورسٹی سے منظور شدہ تھا ،داخلے لے لیا (نوٹ اس زمانے میں انٹربورڈ نہیں تھے) ۔ میں نے پنجاب سے انٹر کا امتحان دینے کی کوشش کی تیاری بھی شروع کی مگر مالی حالات کی وجے سے معاملے آگے نے بڑھ سکا ،آخر کار بوجے مجبوری کراچی بورڈ سے نویں دسویں کا امتحان کمبائن 1965ء میں اکٹھا بحیثیت پرائیویٹ امیدوار کراچی بورڈ سے دیا۔ میٹرک کا نتیجے بھی ایک ڈرامے رہا۔ ڈاکیارڈ کے چکر میں پڑھنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا اور ناہی موڈ ہوتا تھا۔ ٹیوشن وغیرے کا بھی کوئی آسرا نہیں تھا ہاللے کا نام لے کر امتحان دیا ہامتحان دینے میں والدے صاحبے کا ہاتھ تھا ہی مگر' پتلی' اور' انی' کی بیٹی سلطانے جو اس وقت ہوم اکنامکس کالج مقابل آغا ہسپتال میں B.sc کی سٹوڈنٹ تھی۔ بہت ہمت دلوائی اور زور دیا کے بس' تو' امتحان میں بیٹھ جا، پاس ہو جائے گا ہخدا خدا کر کے امتحان دیا۔ طیب علی علوی اسکول جو سٹی کورٹ کے بالکل سامنے تھا ،ہمارا سنٹر بنا ،جلیل نے تو خوب نقل ماری ،'میں' بزدل تھا، لہذا گزارا کیا بس صرف دو ماہ بعد نتیجے آگیا۔ سب عزیزوں کا خیال تھا کے میں پاس ہوجاؤں گا کیونکے امتحان والے روز کتاب الٹ پلٹ کر لیتا تھا۔ رات کے گیارے بجے رزلٹ آیا ،کورنگی نمبر 5 کے ایک ٹیوشن سینٹر پر جاکر محترم استاد کو اپنا اور جلیل کا رول نمبر دیا ہاستاد صاحب نے فرمایا اوپر والا نمبر' پاس 'کی لسٹ میں نہیں ہے اور نیچے والا نمبر جو جلیل کا تھا،" تھرڈ ڈویژن"میں پاس ہوگیا ہے۔ تمام اخبار چھان مارا اور ڈویژن کا نتیجے دیکھتے رہے اور فرسٹ ڈویژن میں بھی دیکھا مگر ناکامی ہوئی ، پتلی اور سلطانے بہت روئیں کہ جلیل پاس ہوگیا۔ جلیل تو تمام رات سو رہا تھا ،وے پاس ہو گیا اور ہمارا بھائی رہ گیا۔ اس دور میں ماجد بھائی بھی لانڈھی میں ہمارے ساتھ رہے تھے میری حوصلے افزائی کی اور 'میں'، یعقوب، جلیل اور قیوم کو رات 12 بجے ریکارڈنگ والے ہوٹل میں چائے پلانے لے گئے۔ جو بس اسٹاپ کورنگی نمبر 6 پر واقع تھا ۔یعقوب بھائی بچارے رزلٹ معلوم کرنے گھر آئے تھے، وے بھی بہت افسوس کر رہے تھے کہنے لگے یار جلیل پاس ہو سکتا ہے تو تم کیوں نہیں ہوئے بہرحال ہوٹل میں چائے پی رہے تھے ہمارے ساتھ والی ٹیبل پر ایک صاحب رزلٹ والا اخبار لیے بیٹھے تھے، یعقوب بھائی نے مسکین سی صورت بنا کر اخبار مانگا اور فرسٹ ڈویژن سے نتیجے دیکھنا شروع کیا اس کے بعد سیکنڈ ڈویژن کا نتیجے دیکھا اور ایک جگے ٹھہر گیا اور ماجد بھائی سے رول نمبر کی تصدیق کی اور ماجد بھائی کو میرے ایڈمٹ کارڈ سے (جو اس وقت ماجد بھائی کے پاس تھا) نمبر ملا کر دیکھنے کو کہا نمبر ٹریس ہونے پر چیخ کر کہا' تو' پاس ہوگیا اور نمبر پر پنسل سے نشان لگا دیا۔ میں نے یعقوب بھائی سے جھٹ کر اخبار لیا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی تاکے اماں جان کو آج اچھی خبر سناؤ کے انہیں زیادے دکھ تھا۔اندھیرے میں ڈر سے۔راستے میں چپل بھی پیروں سے نکل گئی ،میرے پیچھے یعقوب تھے اور وے میری چپلوں کو سمیٹ رہے تھے میں ایک منٹ کے اندر گھر پہنچ گیا ہاماں جان کو خوشخبری سنائی، انہوں نے مجھے گلے لگا ،پھر سجدے میں گر گئی شکرانے کے نوافل ادا کئے ۔پتلی اور سلطانے خوشی سے رو رہی تھی۔ بہرحال یے زندگی کی بڑی خوشی تھی اس دوران گھر کے دیگر افراد جمع ہوگئے تھے اور اماں جان کو

مبارکباد دینے لگے ۔ ماجد بھائی جو ہوٹل میں رہ گئے، اخبار والے صاحب سے معذرت کر کے مٹھائی لے کر گھر آ گئے ۔انہوں نے تمام گھر والوں کو مٹھائی کھلائی، یعقوب بھائی بھی بہت خوش ہوئے اور تمام گھر والے بھی خوش تھے ۔بڑی اماں 'دادی' بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ میرا دل ڈاکیارڈ میں نہیں لگ رہا تھا لہٰذا میں نے استعفیٰ دینے کا پروگرام بنا لیا اور نیشنل شپنگ کارپوریشن میں پھرسٰ 5th انجینئر کے لیے اپلائی کر دیا۔ چار چھ ماہ بعد اتفاق سے مجھے چانس مل گیا ۔'ڈاکیارڈ' والوں نے بھی میرا استعفیٰ منظورکرلیا۔ استعفیٰ مشروط تھا۔ والد صاحب اور گارٹنر ڈاکیارڈ آئیں اور استعفی کی تصدیق اور وظیفے کے چار ہزار روپے واپس کردیں۔ رقم یکمشت ادا کرنے کی شرط تھی، حالات ایسے تھے کہ تین چار ہزار کا فوری بندوبست نہ ہو سکا ۔نے والد صاحب اور اور چچا صاحب ہاتھ آ رہے تھے ۔غلام قادر صاحب کی فیملی کو بھی جلیل کو ڈاکیارڈ سے نکالنے کا پروگرام نہیں تھا ۔عزیزوں نے مخالفت کی اور کچھ حالات نے ایسی صورت میں خاموشی اختیار کی۔ موقع ضائع ہوگیا ۔ڈاکیارڈ میں دلچسپی کم ہوگئی، میں بھی زیادہ چھٹیاں کرنے لگا۔ ڈپارٹمنٹ کے کئی افراد سے" تو تو میں میں" ہونے لگی ،کچھ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔ میرا مشروط استفعی تو ڈاکیارڈ والوں کے پاس تھا۔ 30 مارچ 1966ء کو میری سروس سے مجھے فارغ کر دیا گیا۔30 مارچ کو میں کینٹین سے لنچ کر کے گھر جانے کا پروگرام بنا لیا، اس دوران لنچ اخبار پر میری نظر پڑی،"فزیکل کالج میں ٹیچر ٹریننگ "30 مارچ آخری فیصلہ تھی ۔میں ڈاکیارڈ سے سعید منزل سے ہوتے ہوئے صدر جانے والی بس میں سوار ہو گیا ۔تھوڑی دیر بعد سعید منزل پر پہنچ گیا، ساڑھے تین بجے کا وقت ہو رہا تھا ۔میڈیکل ایجوکیشن برانچ میں افتخار صاحب کے پاس گیا ،انہوں نے اوپر سے نیچے غور سے دیکھا اور کہا بھائی یہ فارم لو اور ضروری کاغذات لگاؤ میں نے کہا سر اس وقت میرے پاس کاغذات نہیں ہیں، کاغذات لینے مجھے لانڈھی جانا پڑے گا یہ تو بہت مشکل ہے انہوں نے دوبارہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا واقعی داخلے کے خواہشمند ہو تو کل 31 مارچ کی صبح دس بجے تک کاغذات جمع کرا دو میں فارم پر تمہارا نام لکھ کر رکھ لیتا ہوں اگر صبح گیارہ بجے تک نہیں آئے تو تمھارا فارم ضائع ہو جائے گا میں نے ان کا شکر ادا کر کے گھر پہنچا اور اماں جان سے ساری روداد سنائی ۔انہوں نے کچھ نہیں کہا صرف کہا اللہ کی مرضی۔ میں نے مشورے مانگا انہوں نے کہا اب تو تم فارغ ہو کوشش کر کے دیکھ لو بہر حال میں نے داخلے کام فارم جمع کروا دیا ۔ اپریل میں انٹرویو ہوئے اور جولائی میں داخل فائنل ہو گئے۔ بفضل اللہ تعالی میرا داخلہ ہو گیا۔ یکم اگست 1966ء سے کلاسس لگنی شروع ہو گئی۔ کالج کے اوقات دوپہر ڈیڑھ بجے سے شام ساڑھے پانچ بجے تھے۔ سیکنڈ شفٹ میں کلاسس جیکب لائن ٹیکنیکل اسکول میں ہوتی تھی۔

کیونکے کالج ناظم آباد میں زیر تعمیر تھا۔ اگست 1966ء سے کالج جانا شروع کیا۔ پہلا بیچ چالیس اسٹوڈنٹ کا تھا ۔جس میں 27میل اور 13 فیمیل طلبہ و طالبات تھے۔ ایک نئی مصروفیت شروع ہوگی۔ بھائی صاحب اس وقت گھر کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتے رہتے تھے ۔اس دوران بلدیہ کورنگی کا قیام عمل میں آیا ۔ میں نے بلدیہ میں نوکری کے لیے درخواست دی۔ بلدیہ میں گروپ آکڑہ کلرک کی بھرتی کا تھا۔ اتفاق سے انٹرویو چیف آفیسر صاحب وہ مجھے جانتے تھے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔چیف صاحب نے درخواست پر لکھے ہوئے نام دیکھے اور

پوچھا کراچی سے پہلے کہاں رہتے تھے میں نے بتلایا نوابشاہ انہوں نے کہا تمہارا سلیکشن ہو گیا ۔۔۔ اب بتاؤ کہاں رہتے ہو؟ اور والد صاحب کیسے ہیں؟ لہذا یہ تھی میری پہلی نوکری کی تفصیل میں بڑے اطمینان سے نوکری کرتا رہا یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کے میرے گروپ کے تمام ساتھی آفیسر بنے اگر میں بلدیے کی نوکری میں ہوتا تو میں بھی تین سال بعد افسر بن جاتا میں نے ایک سال بعد نوکری چھوڑ دی جون جولائی میں جو ڈپلومے کے امتحان ہو رہے تھے میں نے چیئرمین بلدیے جناب فیصل صاحب سے چھٹی مانگی مگر انہوں نے چھٹی منظور کرنے سے منع کر دیا میں نے چیئرمین صاحب سے کہا کے اگر آپ چھٹی منظور نہیں کریں گے تو میں مجبورا استعفی دے دوں گا یعنی دے رہا ہوں ہو کیونکے میرے امتحان ہو رہے ہیں بہرحال میں امتحان دینے کے بعد بلدیے کی جاب پر نہیں گیا ۔ اسی دوران مجھے جامعے ملیے اسکول ملیر میں جاب مل گئی ابھی تک میرا نتیجے نہیں آیا تھا انٹرویو بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر محمود حسین صاحب تھے وہ بانی جامعے ملیے کراچی تھے انہوں نے مجھے سلیکٹ کر لیا میں نے جامعے ملیے سیکنڈری سکول میں" فزیکل انسٹرکٹر"۔ کی جاب شروع کر دی انہوں نے یہ شرط لگائی کے میں وارڈن شپ بھی کروں گا میں نے منظور کرلیا بہرحال وارڈن شپ قبول کر نے کے بعد میں 24 گھنٹے کا ملازم ہو گیا جمعرات کو گھر جاتا تھا اور جمعے کی شام واپس اسکول آ جاتا تھا اور یہ نوکری ایک طرح سے مجبوری میں کرتا تھا، مگر میں نے جامعے ملیے سے بہت کچھ حاصل کیا کیا ڈاکٹر محمود حسین صاحب سے ون ٹو ون ملاقات ہوئی بڑے شفیق اور نرم خو شخصیت کے مالک تھے اس تھوڑے سے عرصے میں وہ مجھے میرے نام سے واقف ہونے کی وجے سے نام لے کر مخاطب کرتے تھے بہت سے سینئر اساتذے بھی ڈاکٹر صاحب سے بالمشافے بات کرنے سے گھبراتے تھے میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر تھا میں نے پندرے ماے کے قلیل عرصے میں وہ کچھ سیکھا جو میں برسوں میں نہیں سیکھ سکتا تھا رزلٹ کے بعد سرکاری ملازمت کی کوششیں شروع کردیں رزلٹ میں میرا چھٹا نمبر تھا، ہمارے پرنسپل جناب رضوی صاحب نے ڈائریکٹر ایجوکیشن صاحب سے کہا کے پہلا بیچ ہے آپ سنیارٹی کے حساب امیدواروں کا چناؤ کریں پہلے جو طلبہ نوکری میں نہیں ہیں انہیں موقع دیں اور پہلے فریش Candidate کو لیٹر دیں اس طرح میں دوسرے نمبر پر آگیا ستمبر 1967 کو مجھے بارے بجے دن کو لیٹر مل گیا لانڈھی ہائی سکول میں جوائن کرنے کو کہا گیا میں دو بجے لانڈھی پہنچ گیا لہذا میرا لانڈھی نمبر 1 کے ہائی اسکول سے ملازمت کا آغاز ہوا محمد خان صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب تھے انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا ابھی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کے محبوب صاحب جو ہمارے استاد تھے تشریف لے آئے اور اپنے مخصوص انداز میں کہا ابے کیسے آیا؟ دوسرا سوال تھا مجید صاحب کے کیا حال ہیں ؟میں نے کہا سر ٹھیک ہیں میں پھر خاموش کھڑا رہا اب محمد خان صاحب جو ہیڈ ماسٹر تھے محبوب صاحب سے کہا ابھی یہ آپ کے اسٹاف ممبر ہیں محبوب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ابے بیٹھ کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا یہ میرا سرکاری ملازمت کا پہلا دن تھا تقریبا تین ماے میں لانڈھی ہائی سکول میں رہا جنوری 1968ء میں میرا تبادلے کورنگی نمبر 4 گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر 4 میں میں صبح کی شفٹ میں ہو گیا جناب ارشاد بیگ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے میں GBSS no 4 کورنگی نمبر 4 کے اسکول میں تقریبا اٹھائیس سال تک رہا ۔

درمیان میں صرف ایک ماہ کا لیہ جیکب لائن ٹیکنیکل اسکول میں تبادلہ ہو گیا تھا بہرحال 1967ء سے 1970ء نارمل زندگی گزر رہی تھی ۔"پتلی" فیکٹری میں جاب کر رہی تھی۔ 1970ء میں ابراہیم ماموں صاحب انڈیا سے تشریف لائے میں اور والدہ صاحبہ نیپر بریک صبح صبح پہنچ گئے وہاں محترم شبیر ماموں صاحب بمعہ اپنے برخوردار کے موجود تھے شبیر ماموں، شجاعت ابراہیم ماموں، مامی صاحبہ اور شمع کو لینے سی پورٹ کیماڑی پہنچ گئے جہاز گودی پر کھڑا تھا ابھی مسافر پانی کے جہاز سے اترنا شروع نہیں ہوئے تھے' میں'، یعقوب بھائی ،شبیر ماموں اور والدہ صاحبہ Railing کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے آدھے گھنٹے بعد مسافر اترنے لگے تھوڑی دیر بعد ابراہیم ماموں اپنی فیملی کے ساتھ نظر آئے شبیر ماموں نے ہاتھ ہلا کر استقبال کیا ابراھیم ماموں کسٹم ہال جانے سے پہلے railing کے قریب آئے پھر کسٹم ہال میں چلے گئے ایک گھنٹے بعد ماموں صاحب فارغ ہو کر باہر نکلے والدہ صاحبہ, شبیر ماموں، یعقوب شجاعت اور ابراہیم ماموں کی فیملی نیپر صدر روانہ ہوئے یعقوب بھائی نے اونٹ گاڑی سوار کر دیا حکم دیا ہم لوگ گھر جاریے ہیں تم اونٹ گاڑی پر بیٹھ جاؤ اور سامان لے کر نیپر بریکس گھر پہنچوں بہرحال والدہ صاحبہ اپنے بھائی صاحب سے مل کر لانڈھی روانہ ہوگئیں ابراہیم ماموں نے دو دن بعد کرائے کے مکان میں حیدرآباد کالونی میں شفٹ ہو گئے گھر بہت چھوٹا تھا بہرحال چند ماہ بعد حیدر آباد کالونی میں گزارنے کے بعد لانڈھی میں منتقل ہوگئے ابراہیم ماموں ہندوستان میں Well Set تھے سال 1970 ء گزر گیا ۔ 1971ء کی جنگ کے بعد ابراہیم ماموں کا انڈیا سے رابطہ اور خط وکتابت ختم ہوگئی مالی معاونت میں بھی کمی ہوگی حالات جنگ کے بعد سخت ہو گئے بہر حال ان کے بھتیجے اشفاق اور اقبال اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہے اور ممکنہ طور پر ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی اس طرح سال 1971 ء گزر گیا شادی کی بات چیت مکمل ہو گئی میں اماں جان کی آنکھوں کا معائنہ اور موتیا کے آپریشن کے سلسلے میں اماں جان کو ڈاکٹر صالح کے پاس شام کے وقت ریمبو سینما لے جاتا رہتا تھا ایک دن میں لانڈھی بس اسٹاپ سے نکل کر ایمپریس مارکیٹ کے سامنےاماں جان کا ہاتھ پکڑ کے گزر رہا تھا تو اماں جان نے پوچھا تیری کتنی عمر ہو گئی ہے ؟ میں نے کہا 28سال اماں جان یک دم بولی بہت دیر ہو گئی ہے اب تک تو تیری شادی ہو جانی چاہیے تھی گھر آنے کے بعد اماں جان نے اپنی مہم کا آغاز کر دیا اور رشتے کی تلاش شروع کر دی اور بہن صاحبہ بھی سرگرم ہوگئی ناموں کی ایک فہرست بنائی اور مہم شروع کر دی اسی تگ وود میں سال 1972 ء شروع ہوگیا منے مامی نے محمود کی شادی کا تقاضہ شروع کر دیا ۔ بہر حال بھائی صاحب سے خط و کتابت کے بعد شادی کی تاریخ 11 فروری 1971ء دے دی گئی اور بھائی صاحب فروری کے پہلے ہفتے میں معہ بیگم تشریف لے آئے

پتلی کی شادی کے بعد بھائی صاحب کی مصروفیات کم ہوئی تو انہیں ایک نئے event کی اور مصروفیت کی مل گئی اماں جان اپنی سوچوں میں تھیں بھائی صاحب نے والدہ سے کہا کے رشتے بتلائیں اماں جان نے تین لڑکیوں کا انتخاب کر رکھا تھا جو سب قریبی لوگ تھے اماں جان نے بھائی صاحب کو تین رشتوں کا بتلا دیا اور پہلے نمبر پر ابراہیم ماموں سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔ بھائی صاحب نے کہا کے آپ چھوڑیں میں ماموں سے خود بات کر لوں گا پہلی

ترجیح ابراہیم ماموں سے بات کرنے کی ہوئی اللہ تعالی کے فضل و کرم سے بھائی صاحب نے ماموں کو راضی کر لیا تمام خاندان کی اندرونی مخالفت بہت زیادہ تھی یہاں تک کے بڑی اماں اورانی وغیرہ بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی صاحب ایڈوانس میں ماموں کو اندرون خانہ راضی کرلیا صرف نارمل بات چیت کے لئے بڑی ماں اور انی کو ابراہیم ماموں کی خدمت میں روانہ کیا اور ساتھ میں بھائی صاحب بھی گئے بڑی اماں نے بہ دلی سے رشتہ مانگا بھائی صاحب نے کمال ہوشیاری سے بات آگے چلائی اور ماموں صاحب سے ہاں کروالی عبد اللہ، کریما اور شبیر ماموں وغیرہ نے کافی مخالفت کی لیکن ماموں اور ممانی صاحبہ نے "شکوری" جیسی (اماں جان) بہن کا رشتہ قبول کر لیاعبد اللہ صاحب نے بھی بڑی مخالفت کی کہا کے حق تو چچا زاد کا بنتا ہےاور" جتنی تنخواہ توفیق کی ہے اتنے پیسوں کی تو میری بہن ایک ماہ میں بسکٹ کھاتی ہے" انڈیا والے بھی راضی نہیں تھےمگر ماموں صاحب نے بہن کے بیٹے کا رشتہ قبول کرلیا اس طرح اگست 1974 میں شادی ہوگئی بہت سے رشتہ داروں نے نے طعنے دیے اور نے خوشی کا اظہار کیا اللہ تعالی کے حکم سے شادی کے چند ماہ بعد میرا پرموشن گریڈ 8 سے گریڈ 14 میں ہو گیا تھوڑی تنخواہ بڑھ گئی 1974میں حالات نارمل رہے 1974ء میں عظمیٰ میں پیدا ہوئی اور 1975ء میں میں توصیف پیدا ہوا حالات پھر ٹائٹ ہونے لگے شمع نے شادی کے بعد پرائیویٹ B.A کر لیا تھا اور 1975ء میں C.Tکی ٹیچر ٹریننگ میں داخلہ لے لیا بہرحال 1975 میں پرائمری ٹیچر کی ملازمت اختیار کر لی تو گھر کے حالات آمدنی کے حساب سے کچھ بہتر ہونا شروع ہو گئے وقت تیزی سے گزرتا رہا عظمیٰ اورتوقیر کے بعد مارچ 1980 میں تنویر پیدا ہوا 80-12-18 کو ابراہیم ماموں صاحب کا انڈیا میں انتقال ہوگیا ماموں کے انتقال پر شمع توقیر کو لے کر انڈیا چلی گئی تنویر بہت چھوٹا تھا لہذا تنویر کواماں جان کے سپرد کر کے 15 دن کے لیے نظام آباد انڈیا اسےہوکر جنوری 1981 واپس پاکستان آ گئی تحسین نومبر 1981 میں پیدا ہوا ہوقت تیزی سے گزرتا رہا اور حالات اللہ کے فضل سے بہتر رہے اور اپریل 1983 میں گھر میں ایک حادثہ تنویر کی آنکھ میں چوٹ لگنے کا ہوا جس سے گھر میں کافی پریشانی ہوئی اللہ تعالی نے بڑا کرم کیا تنویر کی آنکھوں کو صحت عطا ہوئی عبداللہ حیدرآباد کاٹی میں کام ملنے کے بعد حیدرآباد منتقل ہو گیا تھا اس لیےشمع تنہا ہو گئی تھی، اماں جان کی وجہ سے ہمت تھی 1983ءمیں جولائی کو مجھے 17 گریڈ مل گیا تھوڑی بہت تنخواہ میں اضافہ ہوگیا ہوقت دھیرے دھیرےگزرتا رہا بچے سکول جانے لگ گئے تھےشمع کا ٹرانسفر کراچی کورنگی "K" ایریا میں ہوگیا اور بچے وہاں جانے لگ گئے توصیف اور عظمی نے ا سٹینڈرڈ ائی اسکول زمان ٹاؤن کورنگی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی چھٹی جماعت میں توصیف کا داخلہ کورنگی نمبر'4' میں اپنے اسکول میں کروایا عظمی کورنگی نمبر '6 'D ایریا کی اسکول میں جانے لگی.میرے اسکول کا معیار آہستہ آہستہ خراب ہونے لگا تو میرے دوستوں نے کہا کے توصیف کو کسی پرائیویٹ اسکول میں داخلہ کروا دوں کیونکے کورنگی نمبر' 4' کا معیار تعلیم خراب ہوگیا ہے بہرحال اس ہی تگ و ود میں ایک،دوسال گزر گئے عظمی اسکول میں آٹھویںVIII’ ’کلاس میں چلی گئیں اس دوران کورنگی لانڈھی کے حالات اور تمام کراچی کے حالات انتہائی خراب ہوگئے MQM کی مار دھاڑعروج پر تھی لہذا پروگرام بنایا کے توصیف کو کیڈٹ کالج پٹارو میں داخلہ

دلوایا جائے ۔توصیف 9th میں پہنچ چکا تھا لیکن کیڈٹ کالج میں آٹھویں کلاس میں داخل ہوتے تھے ۔لہذا توصیف کا آٹھویں کلاس میں داخل ہوگیا ۔یہ سال1989ء کا تھا۔ سیماء ، تحسین اورتنویر وکٹری اسکول K” “ایریا میں پڑھتے تھے۔ توصیف کی طرف سے بے فکری ہوئی تو، توقیر کی فکر لاحق ہوئی ۔1992ء میں توقیر کا داخلہ کیڈٹ کالج میں آٹھویں جماعت میں کروایا ۔تنویر اسٹینڈرڈ ۔ائی سکول زمان ٹاون میں 9th کلاس میں چلا گیا۔کیوں کہ 1993 میں تنویر کو پٹارو میں داخل کروانا مشکل ہو گیا ۔ایک تو مالی حالات اور اخراجات کا معاملہ تھا دوسرا تنویر کی آنکھ کی چوٹ کا مسئلہ تھا۔ بہرحال تنویر نے قربانی دی اور ۔ائی سکول میں داخل دل لگایا اور محنت سے میٹرک “A”گریڈ میں کیا اور ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا اور اچھے نمبروں سے “A”گریڈ میں انٹر پاس کر لیا ۔تحسین صاحب نے آٹھویں جماعت وکٹری سے پاس کر لیا۔"XI"میں تحسین کا جب داخلہ آیا دو مسئلہ تھے ایک اچھے نمبراوردوسرے نمبر پر فیس۔بہرحال کوششیں کر کے پرنس علی بوائز اسکول ملیرمیں داخلہ دلوادیا۔تحسین نے "B"گریڈ میں میٹرک پاس کیااور خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ دلوایا جائے جو کہ open meritپر نا ممکن تھا ۔بہرحال SMکالج میں داخلہ دلوایا۔ میرے ساتھ اسکول میں کام کرنے والی ٹیچرمسز نور جہاں کے شوہر اطہر صاحب نے کوششیں کر کے بیٹے کو ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ دلوادیا۔بہر حال تحسین کا داخلہ ڈی جے کالج میں ہوگیا ۔تحسین صاحب نے“C”گریڈ میں انٹر پاس کر لیا۔ 2002ء میں توصیف نے داؤد انجینئرنگ کالج سے "B.E"کر لیا اور اسے جلدی نوکری مل گئی ۔تو قیر ایک سال آگے تھا لیکن مہران یونیورسٹی میں دونوں کے۔۔۔۔۔۔ تین چار ماہ کے فرق سے مکمل ہو گئے۔ توقیر اور توصیف نے مہران یونیورسٹی سے کیمیکل میں "B.E" کی ڈگری حاصل کرلی۔ توقیر اور توصیف کو ایک ہی کانووکیشن میں گورنر سندھ عشرت العباد نے ڈگریاں ایوارڈ کیں۔ 14ستمبر 2013 ءبروز اتوار کو والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں والد صاحب کے کمرے میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا اور سورے یاسین پڑھ رہا تھا جیسے ہی میں نے سورے یاسین ختم کی شمع نے آوازور انڈے سے لگائی جہاں سے والد صاحب کی چارپائی نظر آتی تھی ۔رانا صاحب دیکھیں اباجان میں کوئی حرکت نہیں نظرآرہی دوسرے لمحے ہی میں اورشمع ابا جان کے سرہانے پہنچ گئے تو دیکھا کے والد صاحب کی روح فانی جہاں سے کوش کر چکی تھی ۔ انتقال سے پندرے منٹ پہلے کہا کے بے چینی ہو رہی ہے میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں میں نے والد صاحب کو بستر پر پیشاب کا برتن لگایا مگر نہیں آیا والد صاحب نے برتن ہٹانے کو کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اب تو قل اور کلمے پڑھنا مشکل ہو رہا ہے کیوں کے وے تنہائی میں پڑھتے رہتے تھے میں نے کہا جتنا پڑھ سکتے ہیں پڑھیں صرف اللہ اللہ کا ورد کریں مجھے معلوم نہیں تھا کے یہ میری والد صاحب سے آخری گفتگو ہے۔۔۔ابا جان کی عادت تھی کے سوتے وقت ہاتھ پاؤں سیدھے کر لیا کرتے تھے اور ہمیں اکثر کہا کرتے تھے جب میں سو رہا ہوں تو تم میرے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دینا میں ہنس کر کہا کرتا تھا آپ کو کچھ نہیں ہوگا آپ پریشان نہ ہوا کریں ہمارے بچے گھر ہی پر تھے توصیف ماروی آئیل فیلڈ"۔AMS "کمپنی کے کام سے گیا ہوا تھا وہ پیر کی شام سے پہلے نہیں آ سکتا تھا کیوں کہ آمدورفت جہاز کے ذریعے تھا لہذا والد صاحب کی تدفین کورنگی نمبر "6" میں کر دی گئی ہم بہن بھائی 11 ستمبر 2003ءمیں یتیم ہو

گئے۔ یہ سب معاملات اللہ کی طرف سے تھے۔والد صاحب کے انتقال کے کچھ عرصے بعد توصیف کو جدہ میں ملازمت مل گئی تو توصیف نے "AMS" کو خیر آباد کیا۔ 2004 ء میں تحسین نے عثمان انسٹیٹیو ٹ آف ٹیکنالو جی سے "B.E" کمپیوٹر سائنس مکمل کرلیا ۔21 اگست 2004ء کو میری ریٹائرمنٹ تھی اور شمع کی 25سال ملازمت کے مکمل ہوگئے تھے۔ تحسین نے ضد کی کہ امی بھی ریٹائرمنٹ لے لیں نہیں تو میں نوکری نہیں کروں گا اور نہ ہی M.sc Telecom میں داخلہ لوں گا۔ بہت سمجھایا کہ دسمبر 2004ء کے فوری بعد ریٹائرمنٹ لے لیں گے ۔ بہرحال بڑی مشکل سے راضی کیا یا شمع کی ریٹائرمنٹ کے لیے ایڈوانس میں درخواست دے دی اور یکم فروری سےشمع نے بھی ملازمت کو خیر آباد کردیا۔ توصیف "AMS" میں زاہد صاحب کی کمپنی میں ملازمت کر رہا تھا۔ تنویربھی یونیورسل ٹینری میں Quality Assurance Engineeringکی حیثیت سے ملازمت شروع کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔جنوری2005ء کے دوسرے ہفتے حج تھا ۔ 10 دن دسمبر کے اور دن 29 جنوری 2005 ءکے سعودیہ میں قیام پذیر رہا۔ توصیف بھی سعودی عرب میں ہی تھا۔لیکن توصیف کی۔۔۔۔ پوسٹنگ میں تھی۔جو کے مکہ شریف سے تقریبا پندرہ سو کلومیٹر دور تھا۔مسلہ توصیف کی چھٹی اور کفیل کی اجازت کا تھا۔کمپنی نے توصیف کو جاپان ٹریننگ کے لیے select منتخب کیا تھا۔ اور 20 جنوری کو جب ان روانگی تھی۔ ٹریننگ پکا چانس تھا۔ لیکن توصیف نے ماں باپ کے ساتھ حج کرنے کو ترجیح دی اور پیسے کمانے کے چانس کو چھوڑ دیا۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہمیں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ توصیف 7 ذوالحجہ سے17 ذوالحجہ تک ہمارے ساتھ رہا۔ توصیف کی وجہ سے شمع کو طواف کعبہ، وقوف عرفات، قیام مزدلفہ اور رمی میں کافی سہولت ہوئی۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہم خیر و عافیت سے اپنے حج کو ادا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔۔۔ آمین۔۔۔ نیا سال 2005 ء مبارک رہا۔ 2003ءاور 2004 ءبڑا سخت گزرا تھا۔ والد صاحب کا انتقال 14 ستمبر 2003 میں اور 2004ء 21اگست کو ملازمت سے ریٹائرمنٹ۔ گھریلو ٹینشن کسی اچھی جگہ پلاٹ کی تلاش۔ بہرحال حج پر جانے سے ایک ہفتہ پہلے اپنی limit میں پلاٹ پسند آگیا اور ہم نے ٹوکن کر دیا اور دو ماہ کا payment وقت لے لیا۔ سعودیہ سے واپسی کے دو ہفتے بعد ہم نے پلاٹ کا قبضہ لے لیا۔ اب مسئلہ گھر بنانے کا تھا۔ لانڈھی کے گھر فروخت کر کے اور میری پینشن کے پیسوں سے بڑی مشکل سے پلاٹ خریدا تھا۔ شمع کی پنشن کی رقم بھی تھوڑی تھی مکان بنانا مشکل تھا۔ اللہ اللہ کر کے 2007 میں مکان مکمل ہوگیا اور ہم لوگ ڈیفنس ویو سے المسلم شفٹ ہو گئے۔ 27 رمضان المبارک کا دن تھا۔ اٹھائیسویں سحری ہم نے المسلم کے مکان میں کی۔ باقی بچا کچا سامان 28 ویں روز کو ہم لے آئے تھے۔ میں 27 رمضان المبارک کو صبح سحری کے وقت پیدا ہوا تھا۔ اسلامی لحاظ سے 27 رمضان المبارک بڑا عظیم دن ہے۔۔۔ لانڈھی سے ہجرت ،نوکری، بچوں کی تعلیم تعلیم اور ان کے ابتدائی ملاز مت اور والد صاحب کا بڑھاپا پھر اس کے بعد 14 ستمبر 2003 کو والد صاحب کا انتقال، شمع کا ذہنی دباؤ اور دیگر پریشانیاں وغیرہ وغیرہ۔ ڈیفینس ویو میں پانی کی پریشانی۔ لہذا المسلم کی پہلی میٹھی عید بہت میٹھی گزری۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندگی کی بھاگ دوڑ میں ٹھہرا آ گیا۔ میں نے بھی ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کو سکون سے گزارنے کا طریقہ سیکھ

لیا۔ المسلم اس لحاظ سے بھی منفرد رہا کہ 1996ء میں عظمی کی شادی کے بعد تمام بچوں کی شادیاں المسلم میں ہی ہوئیں۔

سیماء کے نکاح کی تاریخ 31 مئی 2008ء

توصیف کے نکاح کی تاریخ 8 مئی 2009 ء

تنویر کے نکاح کی تاریخ 21 مارچ 2013ء

تحسین کے نکاح کی تاریخ 6 نومبر 2015 ء

2016ء سے تا حال اب یونیورسٹی ٹاؤن بلاک نمبر 1 میں تاحال سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور زندگی کا سفر جاری ہے۔

ختم شد

دیوان خانہ اور موٹر خانہ

دیوان خانہ لفظ بیٹھک کی جگہ استعمال ہوتا تھا اور موٹر خانہ گیرا ج کو کہتے تھے۔جیسا کہ میں اپنے مکان کاواقعہ نرمل کا اپنی کہانی سے تفصیل سے بیان کیا تھا۔مہمان خانہ کافی کشادہ تھا۔50 سے 100 فٹ کا ایک وسیع و عریض ہال تھا سامنے 20 سے 100فٹ کا ورانڈا تھا ۔اس طرح ایک 14 فٹ اونچا اور 30 فٹ چوڑا اور تقریبا 60 فٹ لمبا موٹر خانہ (گیراج)تھا۔ جس میں بیک وقت دو لڑکے کھڑے ہو سکتے لیکن میں جب چھوٹا تھا تو دیکھا کرتا تھا کہ ایک نئی شیورلیٹ گاڑی اس میں کھڑی رہتی تھی ۔صبح شام اس کی صفائی ہوتی تھی میں نے اسے چلتے نہیں دیکھا ۔میری دانست میں دو وجہ تھیں۔ایک تو شہر یا قصبہ کے لیں، بہت چھوٹا تھا۔ دوسرے شیورلیٹ گاڑی خریدنے کے بعد عید کے موقع پر والد صاحب نے گاڑی نکالی اور وقت سے پہلے عید گاہ جانے کی ٹھانی۔گھر سے تھوڑے فاصلے پر روڈپر جمعدارنی جھاڑو دے رہی تھی ،ٹکر ماردی وہ فورا ہلاک ہوگئی۔والد صاحب فورا گھر واپس آ گئے دادا صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے فورا ہمارے ماموں صاحب محمد علی خان ایڈوکیٹ صاحب سے رابطہ کیا انہوں نے مشورہ دیا کہ انہیں گھر پر رکھیں۔ باہر نکلنے نہ دے میں خود آ کر کوتوالی (تھانے) میں پیش کروں گا۔دادا

صاحب چونکہ مشہور ٹھیکیدار تھے ہندو افسران اورمسلمان افسران سب سے تعلق تھا سبھی اظہار ہمدردی کے لیے دادا صاحب کے پاس آ رہے تھےمختصر یہ کہ ماموں صاحب نے والد صاحب کوتوالی میں پیش کیا اور فوری ضمانت کروا کر گھر لے آئے جمعدارنی کے سرپرستوں کو دیت (خون بہا) دے کر مقدمہ ختم کروایا ہاس واقعہ کے بعد بعد شیورلیٹ گاڑی گیراج کے نظر ہو گئی اور کئی سالوں تک موٹر خانہ (گراج) کی زینت بنی رہی اور یہ کہانی بھی اختتام کو پہنچی

'بھوجی'

بقول والدہ محترمہ کہ میں پیدائش کے وقت شدید بیمار ہوگیا تھادادا صاحب نے میری دیکھ بھال کے لیے ایک" ہندو خاتون "کو رکھ لیا یا یوں کہیں کہ ایک آیا مقرر کردیڈاکٹروں سے علاج ہورہا تھا مگر کوئی افاقہ نظر نہیں آ رہا تھایہ حالت بقول والدہ صاحبہ کہ "تین سال" رہی'ماسی بھوجی' نے والدہ صاحبہ سے کہا کہ ایک"گونڈنی" دوائی دیتی ہےآپ کہیں تو میں اسے بلوا لیتی ہوںکیس دادی صاحبہ کے سامنے پیش ہوا،دادی صاحبہ نے ایک طویل انٹرویو کے بعد منظوری دے دیہاں یہ بتلاتا چلوں کہ "گونڈ"حیدرآباد دکن میں ایک قوم تھی؛ جو زیادہ تر جنگلوں میں رہتی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں اور قصبوں میں آنا جانا شروع کردیابہرحال گونڈنی نے میرا علاج کردیا اور میں پندرہ بیس دن میں نارمل ہوگیا ہمارے خاندان کی ایک بزرگ خاتون اکثر مجھے پیار سے "گونڈ" کہتی تھیں ہم 1949ء میں پاکستان آگئےمجھے 1948ء سے پہلے کے واقعات بہت کم یاد تھے اور ہیں ہمیں پاکستان آنے کے بعد معلوم ہوا کہ 'ماسی بھوجی' کو "کوڑھ" کا مرض لاحق ہوگیااور وہ اپنے گھر پر ہی رہتی ہیں1955ء دسمبر میں جب حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا تو والدہ صاحبہ نے خصوصی طور پر ماسی بھوجی کو بلوایااور اس کی دل جوئی کی اور اس کے لیے دعا کیاللہ تعالی ماسی بھوجی

کو اس خطرناک مرض سے شفاء دے اور اس کی مالی مدد بھی کی۔پاکستان آنے کے کئے سال بعد معلوم ہوا کہ ماسی بھوجی کا (دہانت)انتقال ہو گیا ۔۔۔

گوپال

حیدرآباد پولیس ایکشن سے قبل دادا صاحب کو ضلع عادل آباد میں ایک بڑا ٹھیکہ پولیس لائنز کا مل گیا تھا وہاں بھی اپنے بچپن کے کچھ دن گزارے۔ پولیس لائنز کے ایک مکان میں ہماری رہائش تھی۔ گھر کے سامنے ایک بہت بڑی گٹھرسی(جھگی) تھی جو اسٹور کا کام کرتی تھی۔ سائٹ کے منشی اور اسٹور کیپر کے فرائض گوپال کے ذمے تھے۔ 'میں' والدے صاحب اور چھوٹی بہن 'پتلی' پولیس لائنز کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ والد صاحب نرمل - نظام آباد اور عادل آباد کے چکر میں رہتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب، دادا صاحب اور چھوٹی پھوپھو کے پاس نرمل میں رہتے تھے۔ گوپال کی ذمے داریوں میں کسی مزدور کو شہر بھیج کر سودا سلف اور سبزی ترکاری منگوا کر دینا بھی تھا۔ گھر میں واٹر سپلائی کے لائن نہیں لگی تھی۔ تین چار خواتین صبح سویرے آ کر پانی بھر کر لاتی تھیں۔ ویسے تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ایک طرف جنگل اور دوسری طرف پولیس لائن سے ڈیڑھ یا دو کلومیٹر دور شہری آبادی اور بازار وغیرہ تھے۔ میں گھر سے باہر نکل کر شام کے وقت گوپال کی جھگی کی طرف نکل جاتا تھا وہاں گوپال اپنے پاس بٹھا کر پکوڑے کھلاتا لیکن مجھے گھن سی آتی تھی بہرحال میں پکوڑے کھا لیتا تھا دو-چار ماہ گزرے، دادا صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ اس جنگل میں رہنا مشکل ہے تو انہوں نے ہمیں نظام آباد بلوا لیا اس طرح گوپال کی کہانی بھی ختم ہوئی۔

رام لو

رام لو، دادا صاحب کے پاس ایک ہندو نوجوان لڑکا گھر کا سودا سلف لانے اور دیگر بیرونی کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ بھینسوں کا چارہ لانا بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ بہرحال دادا صاحب کی خدمت کے فرائض رام لو کے ذمے تھے۔ 11 ستمبر 1948ء کے چند دن کے بعد رام لوگ کام چھوڑ کر چلا گیا۔ معلومات کرنے پر انکشاف ہوا کہ رام لو نے کانگریس میں شرکت کرلی ہے اور وہ پکا کانگریسی کارکن بن گیا۔رام لو کے آنے جانے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن گھر کے فرد کی حیثیت سے اسے گھر کے اندرونی حالات اور ذرائع آمدن اور کاروبار کے متعلق معلومات تھیں۔ لہذا گھر والے ڈرتے تھے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر کوئی گڑ بڑ نہ کرلے مگر رام لو نمک خور ملازم تھا شہر میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہوتی تو دادا صاحب کو پیشگی کی اطلاع دے دیتا تھا۔ جب بھی کوئی گھر کا فرد پاکستان سے انڈیا دادا صاحب سے ملنے جاتا تو رام لو کو جیسے ہی معلوم ہوتا تو فورا سلام کیلئے حاضر ہوتا تھا۔ جب میں اور والدہ صاحبہ 1955ء میں بھارت گئے رام لو نے حاضری دی۔ چھوٹے ملازم والدہ سے بہت متاثر تھے اور وہ والدہ صاحبہ کی بڑی عزت کرتے تھے اور والدہ صاحبہ بھی حسب توفیق ملازمین کی مدد فرماتی تھیں۔ صرف دادی صاحبہ پرانے ملازمین کے آنے سے خوش نہیں ہوتی تھیں بلکہ پریشان ہوتی تھیں۔ بہرحال ان کی سوچ اپنی جگہ تھی "کافر لا اعتبار"۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اس خوف سے جان چھوٹی۔

مینا

پاکستان آنے کے بعد نوابشاہ منو آباد میں زیادہ عرصہ قیام رہا ۔منوآباد ہمارے گھر کے ارد گرد زیادہ راجستانی لوگ رہتے تھے لوگ زیادہ غریب ہی مگر انکی عورتیں گھر کا کام نہیں کرتی تھیں بھلے، امرود اور بیر فروخت کریں یا چھوٹی موٹی کریانے کی دکان یا پان کا کھوکھالگانا بہتر خیال کرتی تھیں والدہ صاحبہ محلے کی بچیوں کو شام چار بجے کے وقت قرآن شریف سبیل اللہ پڑھاتی تھیں بچیاں والدہ صاحبہ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تھیں مگر والدہ صاحبہ سختی سے منع فرما دی تھی، بہرحال والدہ صاحبہ نے مینا کی والدہ سے کہا کہ کسی کام کرنے والی (ماسی) کا بندوبست کرو اس کی والدہ نے کہا اپنے محلے میں تو ناممکن ہے بہرحال میری بیٹی صبح آ کر آپ کا ہاتھ بٹا دے گی والدہ صاحبہ نے اس بات کو قبول کرلیا اورمحلے میں کسی سے ذکر نے کرنے کی درخواست کی ہمارے گھر میں جگہ تو کافی تھی مرغیاں پال لیں آہستہ آہستہ مرغیاں تو ختم ہوگئیں ایک مرغا بچ گیا مرغا بڑا لڑاکو تھا جب گھر سے باہر جاتا لہو لہان ہو کر آتا تھا مختصرا یہ کہ لڑائی میں اس کی آنکھیں بھی ضائع ہوگئیں بہرحال وہ گھر کی چوکیداری خوب کرتا تھا گھر میں کوئی نیا آدمی آئے تو آنکھوں سے اوجھل ہو کر حملہ کرتا تھا محلہ کے بچے تو دروازے سے اندر داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے بلکہ مرد خواتین کو بھی پریشانی ہوتی تھی جب تک گھر کا فرد آواز لگا کر نہیں کہتا کہ مت کرو مہمان ہیں تب تلک وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا لہذا جب مینا صبح آتی تو آواز لگاتی اور والدہ صاحبہ مرغے کو منع کرتی تو وہ بیچاری گھر میں آکر والدہ صاحبہ کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور جاڑو برتن اور صفائی کا کام کر کے چلی جاتی ڈیڑھ سال کے بعد مینا کی شادی ہوگئی والدہ صاحبہ کو پھر مشکل پیش آنے لگی

غفوری

نواب شاہ میں ہمارے گھرسے دو تین فرلانگ پر بجلی کا پاور ہاؤس تھا پاورہاوس سے دو گلی پہلے روڈ پر ایک بڑی بی جس کا نام غفوری تھا آتے جاتے والدے صاحبہ سے دعا سلام ہوتی تھیں والدے صاحبہ اکثر اس کی تیمار داری کرتی تھی کبھی دوا دلوادی کبھی بازار سے دوائی منگوا کے دی والد صاحبہ نے غفوری صاحبہ سے کام کرنے والی ماسی کا کہا وہاں بھی مسئلہ یہ تھا کے راجستانی غریب عورتیں گھریلو کام کاج نہیں کرتی تھی جب کوئی بندوبست نہیں ہوا تو بڑی بی نے اپنی خدمات پیش کر دی ۔ وہ سال ڈیڑھ سال کام کرتی رہی اس کے بعد وہ بیمار ہو گئی ہوہ اپنے گھر پر ہی چارپائی پر لیٹی رہتی تھیں والدے صاحبہ اکثر اس کے پاس دلجوئی اور دوائی وغیرہ دلوانے جاتی تھی ہسال کے بعد تو ہم نے انڈیا جانے کا پروگرام بنا لیا تھا انڈیا سے واپس آ کے ہم نواب شا ۔ نہیں گئے ہاس طرح ایک اور دور مکمل ہوا

بڑی بی

1965ء کے ادوار میں والدہ سے وہ پر کام کا بڑا دباؤ تھا ۔تقریبا 40 افراد کا ناشتہ دوپہر کا کھانا شام کا کھانا والدہ صاحبہ بھی پریشان رہتی تھی۔ ماسی کا بندوبست کرتی تھی تو وہ ہفتہ دو ہفتہ کام کر کے چھٹی کر لیتی تھیں۔ کوئی مستقل ماسی کا بندوبست نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہرحال وقت گزر رہا تھا۔ ایک ضعیف بوڑھی خاتون نے گھرمیں کام کرنا شروع کیا۔ بڑی بی نے والدہ صاحبہ کو کہا کہ جتنا ہو سکے گا کام کرو گی۔ والدہ صاحبہ بڑی بی کا بہت خیال کرتی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتی تھی تو والدہ صاحبہ ان کو چائے پیش کرتی تھیں۔ بڑی بی بھی سلیقہ مند تھی وہ گھر میں داخل ہو کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھی اور والدہ صاحبہ انہیں سبزی بنانے کو دے دی تھی اور آٹا گوندنے کا سامان ان کے حوالے کر دیتی تھی اور آخر میں برتن وغیرہ کی صفائی اور گھر کی صفائی کرتی تھی۔ والد صاحب والدہ پر بہت غصہ کرتے تھے۔بڑی بی کو نہ بیٹھی کام کرتی رہتی تھی بعض دفعہ وہ بول اٹھتی تھی. "میاں بس کرو۔اتنا غصہ نہیں کرتے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"والد صاحب کا غصہ یک دم ختم ہو جاتا تھا اور بڑے کے احترام میں خاموش ہوجاتے تھے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ والد صاحب نے بڑی بی کی نصیحت کا برا منایا ہو اور کوئی جواب دیا ہو۔بڑی بی بی آٹھ سے دس سال ہمارے یہاں کام کرتی رہیں پھر شدید علیل ہوگئی۔ والدہ صاحبہ ان کی تیمارداری میں مالی معاونت کرتی تھیں۔زندگی نے وفا نہیں کی اور ایک دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حرام خور

میری والدہ محترمہ کی چار بچپن کی سہیلیاں تھیں جن میں سے تین کی ابتدائی پرائمری تعلیم ایک ہی مدرسہ سے حاصل کی اور ناظرہ قرآن مجید بھی ایک استاد سے پڑھا مولوی صاحب جن کا تعلق بھی ہریانہ سابقہ پنجاب سے تھا گھومتے پھرتے حیدرآباد دکن آگئے وہاں راجپوت برادری نے 'بزرگ 'کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بس حیدرآباد دکن ضلع نظام آباد میں آباد ہوگئے نظام آباد دکن میں راجپوت برادری کے چالیس پچاس گھر تھے اور راجپوت قائم خانی راجپوتوں کے گھر تھے اور ایک دو گھر ہریانہ کے علاقے کے گڈیانی کے پٹھان ٹھیکیداروں کے سب کی بیٹھک ا یک ہی جگہ ہوتی ہمارے دادا شفی محمد خان ولد عبد الغنی خان صاحب زیادہ سوشل تھے لہذا زیادہ بیٹھک دادا صاحب کے دیوان خانے پر ہی ہوتی عصر کے بعد سب برادری اور دیگر جاننے والے ایک جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرتے تھے ہم یوں کہہ سکتے ہیں گپ شپ لگاتے تھے سرور خان صاحب پٹھان کی بیٹی رابعہ خالہ تھیں خان صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی رابعہ خالہ میری والدہ کی اچھی سہیلی تھیں دوسرے نمبر پر ہمارے پھوپھا حافظ نیاز محمد خان صاحب کی بہن بلقیس خالہ تھیں خیر سے ان کے شوہر عبدالحفیظ خان صاحب جو کہ قائم خانی راجپوت تھے تیسرے نمبر پر میری والدہ صاحبہ کی تایا زاد بہن بشیرا بوا خالہ تھیں جو ہمارے ماموں کی اکلوتی بہن تھیں اسی طرح والدہ صاحبہ بھی اللہ بخش خان نانا جان کی اکلوتی بیٹی تھیں والدہ صاحبہ 9 سال کی عمر میں اپنی والدہ کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئی تھیں والدہ صاحبہ کی تائی دادی جنت والدہ صاحبہ کا بڑا خیال رکھتی تھیں اسی طرح دو بھائیوں جان محمد صاحب ،نانا اللہ بخش صاحب کی ایک ایک بیٹی تھی والدہ کے دو بھائیوں کی ایک بہن اور بشیرا بوا خالہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں والدہ صاحبہ ہمہ وقت اپنی تائی جنت اور تایا زاد بہن بشیرا کے ساتھ گزارتی تھیں قدرتی طور پر دونوں بھائیوں کی اولاد میں بھی خلوص اور محبت تھی جو کہ زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ مرتے دم تک قائم رہی سرور خان صاحب کی زوجہ رابعہ خالہ کی والدہ سے بے پناہ پیار کرتی تھیں اور والدہ صاحبہ کا بڑا خیال رکھتیں تھیں پاکستان آنے کے بعد وہاں بہادر کراچی اور ماڈل کالونی میں رہتے ہوئے والدہ صاحبہ کو بلوا لیا کرتی تھیں بلقیس خالہ کی بہنیں تھیں اور ہمارے پھوپھا حافظ نیاز محمد خان ان کے اکلوتے بھائی تھے (تین بہنوں کے نام حاجرہ ،بلقیس اور اختری تھے) جن میں سے بلقیس خالہ سے گہری دوستی تھی چوتھے نمبر سے آسمہ خالہ تھیں آسمہ خالہ والدہ صاحبہ کی تایا زاد بہن تھیں اور نانگل گاؤں میں نا نا بو علی بخش ہی رہتے تھے دوسرے دونوں بھائی دکن میں رہتے تھے لہذا گاؤں میں صرف ایک تایا زاد بہن ہی ان کی سہیلی تھیں وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہے پاکستان میں 1949ء میں ہجرت کے بعد جب ہم نے جیل روڈ حیدرآباد کالونی کے قریب اسلام آباد کی کچی آبادی میں قیام کیا وہاں پانی کی شدید قلت تھی والدہ صاحبہ کپڑے دھونے،

نہانے اور ملاقات کے لئے بلقیس خالہ کے گھر جاتی تھیں۔ جناب عزیز خان صاحب خالو کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا اور انکی کی کئی بسیں تھیں۔ان کے چار بیٹے تھے وحید ،نعیم، سلیم اور حمید۔ وحید بھائی بڑے شفیق تھے بڑے پیار سے بات کرتے تھے۔ مجھے منو کے کر بلاتے تھے ۔منو اپنے سے کم عمروں کے لیے احترام اور پیار کا لفظ ہے اکثر ایسا ہوتا تھا کے والدے صاحبے والدے ان کو گھر میں صبح شام ہو جاتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد والدے صاحبے کو بلانے جاتا وے دوپہر کے کھانے پر اسرار کرتی تھی میں دروازے کی طرف دوڑ لگاتا اور کہتا تھا میں کھانا کھا کر آیا ہوں ہوے پیار سے کہتی تھی حرام خور جھوٹ مت بولنا کھانا کھا کر جانا۔ حرام خور ایک طرف سے ان کا تکیے کلام تھا۔ یے تکیے کلام وے پیار میں اور شاید اپنی اولاد کے ساتھ غصے میں بھی استعمال کرتی تھی۔اس ہی طرح ہماری خالہ بشیرا (بوا)بھی پیار محبت اور غصے میں لفظ حرام خور استعمال کرتی تھی۔ کبھی کبھی میرے سسر ابراہیم ماموں محبت اور غصے میں لفظ حرام خور استعمال کرتے تھے جس سے ایک اپنائیت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ یے بات تب کی ہے کے میرے سسر صاحب نے کبھی اپنی اولاد کے علاوے دوسروں بچوں کے لئے یے لفظ استعمال نہیں کیا۔اسی طرح رابعے خالہ دختر سرور خان نانا کے گھر بہادرآباد میں آنا جانا رہتا تھا۔ رابعے خالہ انتہائی نفیس خاتون تھیں اور ان میں بڑا رکھ رکھاو تھا۔ والدے کی تین سہیلیاں (ہماری خالائیں) تو برادری سے تعلق رکھتی تھی۔ جن سے کہیں نے کہیں واسطے پڑتا تھا۔ لیکن رابعے خالہ سے خصوصی تعلق تھا جس کا نتیجے یے ہے کے آج سو سال ہونے کو آ رہے ہیں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد سے ہمارے تعلقات قائم اور وہی احترام محبت اور خلوص قائم ہے جس پر مجھے میری بیوی'شمع' کو اور میرے اولاد کو فخر ہے ہمارے گاؤں والی خالہ آئمہ پارٹیشن کے بعد اپنے شوہر شمشیر خان صاحب نانگانے والوں کے ساتھ کراچی آگئے جب ہم پاکستان آئے تو وے پاکستان میں لیفٹیننٹ تھے کیونکے وے بچے فورس برٹش نیوی میں بھرتی ہوئے تھے اور لیفٹیننٹ کمانڈر ریٹائر ہوئے 1952ء سے لے کر 1965ء بڑے گہرے تعلقات رہے۔م منوڑے کیماڑی بہادرآباد وغیرے ان کے گھر ملاقات کے لیے جاتے تھے کمانڈر شمشیر خالو والدے صاحبے کا بڑا احترام رکھتے تھے وے اکثر چھٹی تک لینے آتے تھے اور واپسی میں خود نفیس بے نفیس خداحافظ کرنے آئے تھے1960ء میں دادا صاحب جیٹی تک پاکستان تشریف لے آئے ہوے ہر ایک دو ماہ بعد دادا صاحب سے ملتے معے فیملی لانڈھی ضرور آتے تھے1970ء کے بعد ریٹائر ہو گئے اور انہوں شمس قاضی جہاز کے کمانڈر سنبھالی (پرائیوٹ شپ) وے سمندر کے پانیوں پر سفر کرنے لگے اور مصروفیت بڑھ گئی علاوے اس کے والد صاحب وغیرے بھی بوڑھے ہو گئے اور دادا صاحب کا انتقال ہو گیا ہاسی عرصے میں ہماری خالہ ائمہ کا بھی کینڈا میں انتقال ہوگیا۔والدے صاحب بھی انتہا کمزور ہوگئے۔جب ملنے والی تایا زاد بہن اور گاؤں کی سہیلی ہی نہ رہی۔تو ملنا ملانا کم ہوگیا۔ ملاقات صرف شادی اور تقاریب تک محدود ہوگئی۔2002ء میں تب ہم ڈیفنس ویو میں تھے۔دو ایک دفعے ملاقات کے لیے گیا مگر وے اپنے ہوش میں نہیں تھے تو میں کیا ملاقات کرتا ان کی بیٹی سے خیر خیریت معلوم کر کے آ گیا۔ملنا ملانا نے صحت زندگی کے ساتھ ساتھ ساتھ ہوتا ہے جب کبھی ماضی کی بات ہوتی ہے تو مجھے یے یے فقراء "حرام خور" بہت یاد آتا ہے

جھتر

میرے دوست اور اسٹاف ممبر شفیع محمد غوری صاحب جو کہ میرے سینئر ساتھی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے تھے روز شام کو میرے گھر آ جاتے اور گپ شپ ہوتی تھی یہ تعلق تقریباً 30 سال رہا اور ان کے انتقال پر ختم ہوا والد صاحب پرانے مسلم لیگی تھے، غوری صاحب میرے کم والد صاحب کے گہرے دوست ہوگئے غوری صاحب نے ہجرت کے بعد شہدادکوٹ میں مقیم ہوگئے شہدادکوٹ سے میٹرک اور میٹرک کے بعد حالات کی وجے سے نوکری کرلی سوئے قسمت بلوچستان میں نوکری ملی وہ جونیئر کلرک بن کر بلوچستان چلے گئے انہوں نے وہاں نوکری کے دوران انٹر- B.Aاور گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ کالج لاہور سے B.Tکیا اور ہائی اسکول ٹیچر بن گئے بلوچستان کے دور افتادے علاقوں میں تبدیلیاں postingہوتی رہتی تھیں غوری صاحب پڑھنے پڑھانے والے شخص تھے بلوچستان کے دیہی علاقوں میں رہتے ہوئے آپ نے علاقائی شاعروں اور علاقائی زبانوں کے متعلق مطالعے کیااور علاقائی تاریخ پر توجے دی بہرحال 1972ء میں سندھ ڈومیسائل ہونے کی وجے سے Repeaterہوکر ہو کر سندھ واپس آگئے انہوں 1972ء کو کراچی میں پوسٹنگ ملیمیں اور غوری صاحب 1996 تک ایک ہی اسکول میں کام کرتے رہے ہمارے اسکول کا نام گورنمنٹ بوائز سیکنڈری نمبر 1 کورنگی نمبر 4 تھا اس کا شمار کراچی کے چند اچھے سرکاری اسکولوں میں ہوتا تھا اسکول نے متعدد طلباء کرکٹ کے اچھے کھلاڑی پیدا کیے کئی ایم پی اے-ایم این پروفیسر اسکول کے طالبعلم رہ چکے ہیں اسلم مجاہد، جسٹس قاضی خالد، پروفیسر اسحاق مدنی اور نعیم اختر ایم پی اے کا تعلق اسی اسکول سے تھا جناب غوری صاحب اکثر ورکنگ کلاس کے انداز کا انٹرویو کیا کرتے تھے انہیں اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، ریاستی اور دیگر زبانوں پر دسترس حاصل تھی ان کے بہت سے شاگردوں نے ان کے تعاون سے ایم اے سندھی اور ایم اے اردو کے امتحانات پاس کیے وہ عوامی رجحان کا اندازے لگانے کے لیے سامنے والے شخص سے اس کی اپنی مقامی مادری زبان میں بات چیت اور سوال و جواب کرتے وہ اکثر مزدوروں سے ان کی دلی بات قبول کروانے کے لیے

اکثر ایک سوال کیا کرتے تھے اگر تمہیں دس لاکھ روپے کے انعامی بانڈ یا لاٹری کی صورت میں مل جائے تو تم کیا کروگے (ستر کی دہائی میں دس لاکھ روپے کی بڑی اہمیت تھی) پہلے تو بندے اپنی کم نصیبی کا رونا روتا لیکن غوری صاحب باتوں کے فن سے اس کی دلی بات قبول کروا لیتے تھے وہ بیچارے ہاری یا مزدورکہتا کے مجھے دس لاکھ روپے مل گئے تو میں زمین خریدونگا غوری صاحب مزدور کی حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے، بہت اچھا خیال ہے کیا! تم اپنی زمین خود کاشت کرو گے وہ جواب میں کہتا ہنا جی- نا میں کاشت کرواؤں گا غوری صاحب مزدور یا ہاری سے کہتے تم جس ہاری سے کام کرواؤ گے، کام نہیں کرے گاتو وہ فورا تڑخ کر جواب دیتا کے میں اسے چھتر لگاؤں گا غوری صاحب کہتے ابھی تک تو تم چھتر کھا رہے ہو اب چھتر لگانے کا ارادہ ہے پھر اسے پیار سے کہتے بھائی چائے پیو اللہ خیر کرے گا مختصرا یہ کے پاکستان کی ایک وسیع آبادی جو غربت کی سطح سے نیچے ہے شہری آبادی میں مل مزدور "مل مالک" اور قصبے دیہات میں کاشتکار اور ہاری "زمیندار/ چودھری" بننے کے خواب دیکھتے ہیں ایسی صورت میں صرف "چھتر" ہے یا تو کھاتا ہے یا موقع ملنے پر مارنا چاہتا ہے

یہ 'چھتر' بھی عجیب 'شے' ہے

کراچی کا مسئلہ

1955ء کو میرا نوابشاہ سے کراچی آنا ہوا 1955ءسے2020ء تک شب و روز میرے سامنے ہے ایوب خان کے دور میں اعظم خان صاحب کے بعد مہاجرین کی آباد کاری کا سلسلہ ختم ہو گیاایوب خان صاحب کے دور میں میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہواس وقت صرف لانڈھی کا علاقہ کارخانوں کا گڑھ تھاسندھی بھائی تو کارخانوں میں کم کام کرتے تھے اور کم کم کراچی کا رخ کرتے تھے کارخانوں میں زیادہ تر مزدور پنجاب سے آتے تھے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے1958ء کے بعد سندھ کےبارسے آنے والی لیبر نے مل ایریامیں قریب کی خالی زمینوں پر ناجائز تعمیرات شروع کردی، کیوں کے مارچ 1953ء کھوکھراپار کی سرحد بند کر دی گئی تھی1958ء کے بعد انڈسٹریز بنانا شروع ہوئی اور کچھ کچھ کنسٹرکشن ہونا شروع ہوئی پٹھان لیبر اور اور ٹھیکیداروں نے کراچی کا رخ کیا پہلے پختون لیبر کھدائی کا کام کرتی تھی اور آج تک کراچی میں انہیں کا دور دورہ ہے پہلے تعمیراتی کام اور ٹیکنیکل کام میں وسطی پنجاب سے لوگ آتے تھے اور اب موجود دور میں جنوبی پنجاب سے آتے ہیں مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ 1958ء کے بعد تقریبا موقوف ہو چکا تھاصوبے سرحد سے آنے والے افراد نے خالی زمین پر قبضے شروع کیا ہجس کی بڑی مثال بڑی بڑی کچی آبادیاں قائدآباد، بنارس، شیرشاہ، کیماڑی، پہلوان گوٹھ ،فرنیئر کالونی، نیلم کالونی ،کلفٹن اور ڈیفنس کے اطراف میں کشمور کالونی ،ڈالمیا ،اورنگی کے کچھ علاقے ہجرت کالونی، کٹی پہاڑی ،سہراب گوٹھ،شیر پاؤ،گیدڑ کالونیمنوڑا ،پرانی سبزی منڈی ،مجاہد کالونی،ہجرت کالونی ہسپتال چورنگی،پنجاب چورنگی میں کھپت ہونے لگی

صوبہ سرحد میں صنعتی اسٹیٹ بنالی گئی مگر غیر ہنر مندلیبر کا مسئلہ باقی رہا۔دوسرا سرداری سسٹم کی وجہ سے غیر ہنر مند پختون لیبر کا رخ کم و پیش کراچی ہی کی طرف رہا اوربلوچستان کا مسئلہ اپنی جگہ ۔۔۔وہاں انڈسٹریز نہیں لگائی گئیں۔کراچی کے منسلک علاقوں حب وغیرہ میں کارخانے لگے اور وہ اب بھی سرداروں کے مرہون منت ہیں۔۔ر فیکٹری آج کے ترقی یافتہ دور میں سرداروں کو یا وہاں کے زور آور لوگوں کوبھتہ دیتے ہیں۔ اگر وہ بھتی نہیں دیں تو وہ فیکٹریاں کام نہیں کر سکتیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا علم پاکستان کے ہرخاص و عام کو ہے اور لوگوں کو یہاں تک معلوم ہے کہ کون سی فیکٹری کس شخص کو کتنا بھتہ دیتی ۔۔۔ اب آجائیں اندرون سندھ کے حالات، وہاں کے دانشوروں نے تعلیم پر کافی لوگوں کو راغب کیا اور انہوں نے چھوٹے شہروں قصبوں کے افراد کو جیسےتیسے ڈگریاں دیکر سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع فراہم کیے۔بھٹو صاحب نے کوٹہ سسٹم کا تحفہ دیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ یہ سسٹم دس سال کے لئے ہے مگر 48 سال سے قائم ہے آنے والے سال میں سلور جوبلی ہو جائے گی پہلے نوکریاں سیاسی اور علاقے کی مناسبت سے پوری کی جانے لگی ۔اس کے بعد سرکاری ملازمتوں کی خرید و فروخت ہونے لگیں۔ اب تو ملازمتیں آکشن کے انداز میں دی جانے لگی ہیں۔اب تو ایک پرائمری اسکول ٹیچر اور عام سپاہی کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے دو لاکھ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔کراچی میں 1980ء تا 1985ءکے عرصے میں مہاجر نوجوانوں کو نفرت کی تعلیم دے کر اور سرکاری ملازمتوں سے دور رکھا گیا ۔اس کے بعد ان کو اخلاقی گراوٹ کے ایسے سبق پڑھائے گئے اور ان کی برین واش کر کے انھیں چور، ڈکیت اور کرمنل بنا دیا گیا۔تمام اخلاقی قدروں کو ملیامیٹ کردیا گیا۔ جو لوگ تعلیم یافتہ اصول پرست ایماندار گردانے جاتے تھے۔ اب نکمے چور اور معتصب قرار دیے جا رہے ہیں ۔مہاجروں کو ایک انمول تحفہ دیا گیا ،اب پچاس سال تک یہ طبقہ حالات کو نہیں بحال کر سکتا۔کراچی کے گرد نواح میں گو ٹھوں میں بسنے والے لوگ انتہائی پرامن اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔اندرون سندھ سے آنے والے افراد نے انہیں معتصب بنا دیا اور رہا سا کام کراچی کے راندے درگا ے کےلوگوں نے پورا کردیا۔دوسرا ظلم یہ ہوا لسانی تعصب کے بعد چھوٹا موٹا کام کرنے والے اور دیہاڑی والے لوگوں میں سے کچھ کوتو لسانی فسادات میں نقل مکانی پر مجبور کیا اور کچھ کو بھائی لوگوں نے لولی پوپ دیا۔قہ لوگ اندرون سے کراچی کا رخ کرنے لگے ۔جس پر انہیں گندے نالوں اور پارک اور دیگر سرکاری زمین چائنا کٹنگ کرکے آباد کیا گیا اور سیاسی مخاصمت کے بعد اور نیا دور شروع ہوا۔سیاسی کارندوں، وڈیروں اور نظم و نسق کے ٹھیکیداروں نے ایک مثلث بنا لی اور کراچی کے عوام کو لوٹنا شروع کر دیا۔ دس فیصد حصے کراچی کے ٹھیکیداروں نے بھی ڈال دیا۔اور کراچی کے کاروباری اشخاص کو راضی خوشی یا زبردستی اپنا پارٹنر بنا لیا اور پیسے لگائے بغیر شراکت دار بن گئے اور دولت کی ہوس میں کراچی کو تاراج کردیا۔ اب بھی اندرون سے کراچی کا رخ کرنے والوں کی پہلی ترجیح سرکاری نوکری اور ایسی جاب ہے، جہاں سے تنخواہ کے علاوہ نوٹ چھاپے جا سکیں ۔اب تو ہر سرکاری ملازم کی اتنی پراپرٹیز (properties)ہے کہ اگر اس گریٹ کے فرد کی تنخواہ کا حساب لگایا جائے تو آپ دانتوں میں انگلیاں دبا لیں گے کراچی میں اندرون سندھ سے آئے ملازم صرف پیر سے جمعرات تک دفتر میں حاضری دیتے ہیں۔ جمعرات کو شام دو گھنٹے پہلے مجھے آفس چھوڑ دیتے ہیں

اور پیر کو دو گھنٹے دیر سے آفس تشریف لاتے ہیں ۔کراچی کے گردونواح میں اندرون شہر گوٹھ آباد اسکیم کے تحت قیمتی زمینوں پر کچی آبادیاں قائم کرلی گئی ہیں۔ اسکیم 33 میں سینکڑوں سوسائٹیوں اور سرکاری قطع اراضی پر گوٹھ یا سوسائٹیاں قائم کر لی ہیں۔ ایئرپورٹ کے گرد بھٹائی آباد، بے نظیر آباد ، بختاور بلاول بھٹو کے نام سے اور پرانے گوٹھوں کے اطراف تجاوزات کرکے آبادیاں قائم کر لی گئی ہیں۔ شہر کے اطراف میں بے نظیر بھٹو غازی گوٹھ، بلاول بھٹو شاہ لطیف ٹاون اور گلشن حدید سے لے کر حب ریور روڈ اور لیاری سے لیکر سپر ہائی وے تک بے شمار گوٹھ اور سوسائٹیاں قائم کر لی گئی ہیں ۔ان قبضے شدے زمین پر قائم ناجائز تعمیرات پر مالکان سندھی اور پٹھان ہیں۔ اور مہاجر، سرائیکی ،پنجابی، بہاری، پوٹھوہاری اور افغانی کرایے دار ہیں۔ سچل جیسی بڑی بڑی سوسائٹیاں، گوٹھ کے نام پر قائم کر لی گئی ۔اس میں حصے کچھ مہاجرین نے بھی ڈالا۔۔۔ گجر نالے کے کنارے پر آباد یاں قائم کرلی۔ 40 فٹ کا' نالے' 14 فٹ تک رہ گیا۔ 800 فٹ کی لیاری ندی 40 فٹ کی رہ گئی۔اس سے عام مہاجر کو کم فائدے پہنچا ہے۔عوام کے کرتا دھرتاؤں نے مال بنایا۔ ایک اور ظلم یہ ہے۔کہ کراچی کی 55 سے 60 فیصد زمین کنٹونمنٹ بورڈ کی تحویل میں ہے ۔کراچی کے اصل باشندوں کو جھگی یا دس دس منزلے عقوبت خانوں میں جائے عافیت ملی۔جب تک ملک میں سماجی انصاف عوام کو نہیں ملے گا تو وڈیروں کے کمداروں، زورآور لوگوں کے گماشتوں اور سرداروں اورSo-called بھائیوں سے جب تک جان نہیں چھوٹے گی۔ کراچی یوں ہی برباد رہے گا۔ مہاجرین 1947 سے 1957 میں یا یوں کہ لیں 1960ءتک آباد ہوگئے تھے۔اصلی مہاجرین تو ڈرائیور اور چپڑاسی۔ خانساماں۔ دھوبی اور کریانے مرچنٹ کی دکان تک محدود ہوگئے۔ جو پڑھ لکھ لیے انہوں نے بیرون ملک کینیڈا، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کا رخ کیا اور وہیں کے ہو گئے۔ کسی نے گرین کارڈ حاصل کر لیا ۔کسی نے امیگریشن اور کسی نے اقامے۔ مہاجر ابھی تک مہاجر ہی ہیں۔ اپنے وطن اور اپنے شہر میں حالات کے پیش نظر ہجرت کی ۔کسی نے ایک شہر سے روزگار اور تعلیم کے خاطر ہجرت کی ،کسی نے اپنی جان مال عزت آبرو اور سکھ اور سکون ایک علاقے سے دوسرے چلے گئے۔تبدیلی سرکار نے بھی مہاجرین کی بربادی میں اپنا حصے ڈال دیا ۔کوٹے سسٹم کو غیر معینے مدت(لا محدود عرصے) تک رہنے کی منظوری دے دی ۔مہاجرین کو بحیرے عرب کا راستے دکھا دیا ۔اللے خیر کرے۔ اس ذہنی اذیت اور لا وارثی کے عذاب سے کب جان چھوٹے گی۔ محسوس ہوتا ہے بحیرے عرب ہی اس قوم کا مقدر ہو گا۔

گورڈن کالج راولپنڈی کا "دادا"

میں ما مئی 2020 کو covid-19 کےلاک ڈاؤن کےدوران ایک ٹی وی پروگرام دیکھ رہا تھا جس میں جناب شیخ رشید صاحب معروف عام "شیدا ٹلی" بڑے فخر سے فرما رہے تھے کہ میں اپنے تعلیمی ایام میں گورڈن کالج راولپنڈی کا دادا تھا، یہ سن کر میں اپنی جوانی کے دور میں پہنچ گیا ایک سابقہ ٹیچر ہونے کی حیثیت سے اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ کالج و محلے کے دادا لوگ انتہائی بزدل اور موقع پرست ہوتے ہیں چند بزدلوں اور نکموں کا ایک ٹولہ بناکر شریف اور طاقتور افراد کو چالاکی سے تنہا پا کر حملہ کرتے ہیں اور اپنا جھوٹا رعب و دبدبہ دکھاتے ہیں اس ضمن میں اپنی زندگی کے واقعات کا احاطہ کر کے داداوں کی ایک سیریل لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں زندگی میں چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں ،مگر یہ میری دانست میں 1962ء یا 1963ء کا واقعہ ہےجب میں پاکستان نیول ڈاکیارڈ میں اپرنٹس تھا میرے بیچ کا ساتھی "راشد" جو الیکٹرک ورکشاپ میں تھا لنچ کے آغاز میں اپنے دوستوں سے ملنے MED شاپ جایا کرتا تھا میں MCD پلیٹر شاپ میں اپرنٹس تھا MEDورکشاپ میں ایک شخص جس کا نام' ریاض ' اور عرفیت' پہلوان' تھی وہاں کے اپرنٹسوں کو بلاوجہ پریشان کرتا تھا وہ اپنے حصے کا کام وہاں کے اپرنٹسوں سے کرواتا تھا اور دھونس دھمکی سے پریشان کرتا تھا اور وقت بے وقت 'چائے پانی اور خرچہ پانی' کا مطالبہ کرتا تھااپنے آپ کو پنجابی باڈی بلڈنگ کلب کا ممبر جتلاتاتھا اور 1962-ـ 1963 کے دور میں کھارادر کے'پنجابی باڈی بلڈنگ کلب 'کی گنڈا گردی سے علاقے کے لوگ بھی پریشان تھے اور کلب کی گنڈا گردی کافی مشہور تھی بہرحال ایک دن راشد میرے پاس آیا اور کئی اپرنٹس لنچ بریک میں جمع تھے اور گپ شپ ہو رہی تھی آتے ہی راشد نے ریاض پہلوان کی چیرہ دستی بیان کی میں نے اپنے ساتھی اپرنٹسوں سے کہا کہ اب موقع ہے ریاض پہلوان سے نمٹ لیتے ہیں، تھوڑی ہمت کرو بھاگنا نہیں، باقی میں نمٹ لوں گا ہم ریاض پہلوان کے پاس پہنچے اور راشد کو پریشان کرنے کی وجہ دریافت کی،پہلوان نے آنکھیں نکال لی اور کہا تم جانتے نہیں میں کھارا در کا دادا ہوں میں نے ورکشاپ میں سے ایک اسٹیل کا پائپ اٹھایا اور پہلوان کی طرف لپکا اور زور زور سے چیخنا شروع کیا ورکشاپ میں شور شرابے سے تمام ورکر جمع ہوگئے میں نے ریاض پہلوان سے کہا آج تیری دادا گیری کا آخری دن ہے ساتھی ا پرنٹسوں نے بھی چڑھائی کر دی اور کہا کہ تجھے اور تیرے کھارادرکلب کو دیکھتے ہیں ورکشاپ میں سو ڈیڑھ سو افرادکام کرتے تھے سب نے ملامت کی فورمین مسٹر سائمن بھی دوڑ کر آ گئے لوگوں نے (ورکروں) نے بڑی مشکل سے ریاض کی جان چھڑائی نیوی کا مسئلہ تھا افسران کو پتہ چلتا تو ریاض کی نوکری جاتی اور دیگر محکمانہ کارروائی ہوتی اپرنٹسوں کو تو صرف ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے بہرحال ریاض نے ادارے سے باہر اور کھارادر میں ٹکرانے کی کوشش کی مگر اپرنٹسوں نے اس کا بھرم ختم کردیا تھا لہذا اس کی بدمعاشی نہ چل سکی شریف لوگوں کی جان چھوٹ گئی اور ایک دادا گیر کی دادا گیری ختم ہوگئی

ڈی جے سائنس کالج کا"دادا"

اسٹوڈنٹ لیڈرشپ حسین جو کہ پہلے 'ڈی جے کالج' کا طالب علم تھا، بعد میں NED انجینئرنگ کالج میں سول انجینئرنگ کا طالب علم تھا. ایک ٹولے کی صورت میں برنس روڈ پر جامع کلاتھ مارکیٹ کے علاقے میں دھماچوکڑی مچاتا اور گنڈا گردی کرتا تھا اور اپنے آپ کو سٹوڈنٹ لیڈر کہلواتا تھا شومئی قسمت ایک دن وہ دس بارہ لڑکوں کے ساتھ گروپ کی شکل میں لانڈھی نمبر 89میں بس کے اسٹاپ ایمپریس مارکیٹ آیا اور ہماری بس میں سوار ہوگیا ۔ میں اور میرا کزن جلیل مرحوم سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے بس میں دو تین سیٹیں بھی خالی تھیں ۔گروپ دس بارہ لڑکوں کا تھا ،بس میں سوار ہوا اور میرے کزن جلیل سے کہا سیٹ چھوڑو ،ہم بیٹھیں گے جلیل تو اٹھ گیا مگر میں نے اٹھنے سے انکار کیا تو شہنشاہ حسین نے اپنا تعارف کروایا کہ NEDکا دادا ہوں۔میں نے کہا میں کیا کروں اوراس نے آنکھیں نکالی اور مجھ پر حملے آور ہو گیا لانڈھی والوں کا ایک کلچر تھا اور شاید اب بھی ہو جب کوئی باہر والا ناجائز اور کسی کو پریشان کرتا ہے وہ مظلوم کے حامی بن جاتے ہیں، بس کے مسافر میری حمایت میں بول پڑے اور میرے ساتھ ہو گئے میں شہنشاہ حسین کو کو گھسیٹ کر لیڈیز کمپارٹمنٹ میں لے گیا، وہاں پر جوابی وار کیے اور پٹائی کیاور خواتین نے بھی ساتھ دیا ۔شہنشاہ حسین کے ساتھیوں کو لیڈیز کمپارٹمنٹ میں آنے نہیں دیا اور موقع ملنے پر شہنشاہ پارٹی کو ایک آدھ ہاتھ جڑ دیا۔میں اور میرے کزن نے ہوشیاری کی کہ چند روز کے لئے بس اسٹاپ تبدیل کر لیا کہ وہ بس اسٹاپ پر اپنے ٹولے کے ساتھ آتا رہا مگر اسے کچھ ہاتھ نہیں آیا ہروزانہ سفر کرنے والے لڑکے اور دیگر افراد، خواتین اور مرد شہنشاہ ٹولے کو دیکھ کر ہنستے تھے اور ٹاؤنٹ کرتے تھے 'لانڈی والا' تمھارے ہاتھ نہیں آئے گا ۔بہرحال NEDاور DJ میں اطلاع پہنچی تو شہنشاہ کی بڑی سبکی ہوئی۔ اس واقعے کو گزرے ہوئے دو، تین سال ہو ئے ہوں گے ایک دن میں واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ایکسن جو ہمارے عزیز تھے کے دفتر گیا ان سے ملاقات کرکے باہر نکلا تو شہنشاہ حسین ،نقوی خان صاحب کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے، باہر چپڑاسی سے پوچھا 'یہ کون ہے؟' کیوں آیا ہے؟ چپڑاسی بھی ایک گھاگ اور تیز اور طرا ر شخص تھا،کہا کہ تم نہیں جانتے ؟یہ ولی بھائی صاحب کا بیٹا ہے والد صاحب کا غصہ KDAمیں بہت مشہور تھا اس دور کے تمام انجینئر سے دوستی اور دعا سلام تھی۔ بہت سے لوگ حیدرآباد دکن کے حوالے سے اور بہت سے ہیدر آباد کالونی کی وجے سے جانتے تھے قصہ مختصر یہ کہ شہنشاہ کی"دادا گیری"NEDکے ساتھ ختم ہوگی۔

پھل فروش "دادا"

خلیل دا دا:کورنگی نمبر 6 کی مارکیٹ کا پھل فروش تھا جس نے آوارہ لڑکوں کا ایک گروپ بنا لیا تھا اور اس وقت کے بڑے بدمعاش 'اصغر لنگڑے 'کا آلہ کار بھی تھا اس کے کچھ چیلے گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے صبح آفس اور اسکولوں کے اوقات میں دھما چوکڑی کرتے تھے اور لوگوں پر فقرے بازی کرتے تھے خصوصاً خواتین اور طالبات پر لوگ بڑے تنگ تھے پولیس والے بھی ان کو کچھ نہیں کہتے تھے ایک دن ایک صاحب نے ان نکمے لڑکوں کو منع کرنے کی کوشش کی جس پر آوارہ لڑکوں کا گروپ شریف آدمی سے الجھ پڑا اور مار پٹائی شروع کردی کچھ محلے والے دوست جو صدر جانے کے لیے کھڑے تھے اور میں ان بدمعاشوں پر پل پڑے اللہ کے کرم سے ہم نے اس آوارہ ٹولے کو مار پیٹ کر بھگا دیا دوسرے دن خلیل دادا اپنے شاگردوں کو لے کر آیا اور مجھے شناخت کرکے کہا مجھے جانتے نہیں ہو؟ کیوں مارا؟ میرا دماغ ایک دم گھوم گیا میں نے فیصلہ کیا کے پوری قوت سے اس پر حملہ کردوں اللہ مالک ہے لوگ میری مدد کو ضرور آئیں گے میں نے دادا صاحب کی دھنائی شروع کردی اتنے اسٹاپ بیچ بچاؤ کے بہانے اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر کھڑے ہوگئے معاملہ ون ٹو ون ہو گیا میں نے اس کا دماغ درست کر دیا اتنے میں پولیس والے آگئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کروایا اور خلیل کو ڈانٹا اور آئندہ اسٹابس پر آنے سے منع کیا اور کہا تم علاقے میں بدمعاشی مت کرو اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ان لوگوں کے منے نے لگو آئندہ اسٹاپ نہیں آئیں گے یہ بات مارکیٹ والوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی اس کی دادا گیری کو چیلنج کیا اس کے علاوہ علاقے کے بااثر افراد نے بھی اس گروپ کو وارننگ دی جس کے بعد خلیل داداکی دادا گیری ختم ہوگئی یعنی ایک عدد شیرا ٹلی انجام کو پہنچا